طلوع اسلام

مارچ ۱۹۵۰

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

مرتب	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
محمد یونس	آٹھ آنے	سالانہ چھ روپے

جلد ۳	مارچ سنہ ۱۹۵۰ء	نمبر ۳

فہرستِ مضامین

لمعات	۳ - ۷
سلیم کے نام	۹ - ۲۶
(محترم پرویز صاحب)	
میں کمیونسٹ ہوں؟	۲۷ - ۳۲
رسول کا مقام	۳۳ - ۳۷
(محترم عباد اللہ صاحب اختر)	
باب المراسلات	۳۸ - ۴۵
۱۔ نمازوں کی تعداد	
۲۔ ناسخ و منسوخ	
۳۔ بیسرہ	
۴۔ نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری	
۵۔ انتخابات	
عالمِ برزخ اور قرآن	۴۶ - ۵۵
(حکیم ابو المنظر صاحب)	
نغمۂ حیات (نظم)	۵۶
(اسد ملتانی صاحب)	
رفتارِ عالم	۵۷ - ۶۹
۲۱۔ اپریل	۷۰ - ۷۱
کچھ اپنے متعلق	۷۲ - ۷۳
قرآنی لٹریچر میں نئی کوشش	۷۴
اشتہارات	۷۵ - ۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

تانگے کا گھوڑا اور اسپ تازی، نوع کے اعتبار سے دونوں گھوڑے ہی کہلاتے ہیں لیکن ان دونوں میں جسقدر فرق ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ببول اور انگور، دونوں درخت ہی پکارے جاتے ہیں لیکن دونوں جس قدر باہمدگر مختلف ہوتے ہیں اس سے کون ناواقف ہے۔ حنظل بھی پھل ہے اور خربوزہ بھی پھل (اور اچھا پکا ہوا حنظل تو بعض اوقات خربوزہ سے کہیں زیادہ خوش شکل ہوتا ہے) لیکن دونوں کی حقیقت کا اندازہ چکھنے کے بعد ہی لگ سکتا ہے۔ بھیڑیا بھی حیوان ہے اور بکری بھی حیوان۔ لیکن ایک پیکر ہلاکت اور دوسری چشمۂ حیات۔ لہٰذا کسی نوع پر کچھ حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ فیصلہ کن عوامل انفرادی خصوصیات ہیں۔ تمام دنیا کے انسان، نوع کے اعتبار سے انسان ہی کہلاتے ہیں لیکن انفرادی خصوصیات دیکھئے تو ایک فرد دوسرے سے اس قدر متخالف و متبائن ہوگا کہ ان میں ظاہری شکل و شباہت کے علاوہ اور کچھ بھی مشترک نہ ہوگا۔ ایک یکسر درندہ دوسرا ہمہ تن پیکر انسانیت۔ ایک از سرتاپا افعی، اور دوسرا وہ کہ اس کا سایہ بھی تریاق کا اثر رکھے۔ ایک وہ کہ اس کے ہاتھوں پر ہر وہ شخص نالاں جس سے اسے بدقسمتی سے سابقہ پڑجائے دوسرا وہ کہ اس کی آغوش ہر مظلوم و ناتواں کے لئے حصارِ عافیت۔ ایک وہ کہ اس کی خشم آگیں نگاہیں ہر قلب حساس کے لئے نشتر و پیکاں۔ دوسرا وہ کہ اس کی چشم گریاں ہر دلِ مجروح کیلئے مایۂ درماں۔ ایک وہ جو اپنی سرکشی و بدعنوانی پر نازاں و فرحاں۔ دوسرا وہ جو خفیف سی لغزشِ پا، پر نادم و حیراں۔ ایک وہ جس کی ہر سانس، ہر ذی حیات کے لئے شعلۂ جہنم اور ایک وہ جس کا ہر نفس ہر متنفس کے لئے مروحۂ جنت۔ ایک وہ جن کی زندگی ہزاروں کے لئے وبالِ جان اور ایک وہ جس کی موت سے لاکھوں آنکھیں خوننابہ فشاں۔

پھر افراد کی طرح، افراد کے مجموعہ یعنی اقوام کی بھی یہی کیفیت ہے۔ قوم انسانوں کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے۔ شکل و شباہت میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے انسان۔ اعضاء و جوارح میں ایک دوسرے کے مماثل انسان۔ لیکن ایک قوم، وہ جس سے انسانیت ڈرتی، کانپتی، سہمی ہوئی ان کی بستیوں سے باہر ویرانوں میں پناہیں ڈھونڈتی دکھائی دے۔

اس کے مامن و مسکن تک پہنچانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی لغزشوں سے درگذر کرنے اور انھیں اپنے عفو کریمانہ کے دامن میں چھپا لینے کی تائید کرتا ہے۔ جھکی ہوئی نگاہیں اس کے نزدیک واجب الاحترام اور عرق آلود پیشانی اس کے قریں چوم لینے کے قابل ہوتی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ ان کے لئے ہے جن میں شرافتِ نفس ہو جن کے زندہ رہنے اور بڑھنے اور پھولنے میں انسانیت کی زندگی اور آدمیت کی بالیدگی مضمر ہو۔ یا جو کم از کم نوعِ انسانی کے لئے وجۂ فتنہ اور موجبِ فساد نہ بن جائیں۔

لیکن اس کے برعکس، جن انسان نما درندوں کی سبعیت و بہیمیت کے ڈرسے انسانیت کانپتی پھرے۔ جن کا وجود شریف انسانوں کے لئے وبالِ جان بن جائے۔ جن کی دنائت دروالت، کمزوروں اور ناتوانوں کے ستانے میں لذت محسوس کرے۔ جو جسدِ انسانیت کے زہر آلود ناسور بن چکے ہوں۔ جن کے شر سے ہر صاحبِ خیر خائف ہو۔ جن کی بدکرداریوں سے ہر نیک طینت انسان ہراساں و ترساں ہو۔ قرآن، انسانیت کو ان شر الدواب انسانوں کی دراز دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے سپر بن کر آگے بڑھتا اور برق خاطف ہو کر ان کے سروں پر گرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است

یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے ہر ماننے والے کو حکم دیتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اللہ کا سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں نکل آئے۔ فیقتلون و یقتلون۔ یا شرفِ انسانیت کو بچالے یا اس کی کوشش میں اپنی جان دیدے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم لبعض لفسدت الارض (۲/۲۵۱) اگر خدا بعض قوموں کے ہاتھوں سرکش و دراز دست قوموں کی مدافعت نہ کراتا رہے تو زمین میں زندگی کی کوئی ہمواری قائم نہ رہنے پائے۔

ان مبادیات کو سامنے رکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے سرحدِ پاکستان کے اُس پار (بھارت ورش میں) بسنے والی اُس قوم پر جو اپنے آپ کو پراچین (دنیا کی سب سے قدیم) تہذیب کی حامل بتاتی ہے اور سوچئے کہ کیا ان میں شکل و شباہت کے علاوہ کوئی بات بھی انسانوں جیسی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ کہنے کو ہر قوم دوسروں کے متعلق بھی کچھ کہہ سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ واقعات و حقائق آپ کو کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ تقسیم ہند سے لے کر اس وقت تک کے حوادث و وقائع پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ہندوؤں کی اس قوم میں، جسے شومیٔ قسمت نے ہمارا ہمسایہ بنادیا ہے،

شرفِ انسانیت کی کوئی رمق اور خصائصِ آدمیت کی کوئی جھلک بھی آپ کو دکھائی دیتی ہے۔ وعدہ خلافی، دروغ بافی، کذب تراشی، افترا طرازی کی کوئی ایسی نہج باقی رہ گئی ہے جو انھوں نے اس اڑھائی سال کے عرصہ میں اختیار نہ کرلی ہو۔ درازدستی، استحصال بالجبر، غصب و نہب، لوٹ کھسوٹ، کی کوئی شق ایسی ہے جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے نہ ہوچکا ہو؟ معاہدات شکنی، بین الاقوامی قوانین سے سرکشی، مواعیدِ ہمسائیگی کی حدود فراموشی، فیصل شدہ معاملات کی خلاف ورزی کی کوئی صنف ایسی ہے جو عمل میں لائی باقی رہ گئی ہو؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قتل و غارتگری، تباہی اور بربادی، عصمت دری اور عفت ربودگی، مسلم کشی اور انسانیت سوزی کی کوئی داستان ایسی ہے جو ان کے سیاہ کارناموں کے سامنے ماند نہ پڑچکی ہو۔ ابوالکلام آزاد نے اپنے "دورِ حیات" میں لکھا تھا:

> کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں، اصلیت کو چھپاتے ہیں، ماجرائے وقوع کو غلط بناتے ہیں، نقضِ امن کرتے ہیں اور اسے جان بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پیچ میں پبلک کو کچھ اور جتاتے ہیں۔ ان کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہوچکا ہے۔ وہ ایرو باختہ ہیں عزتِ نفس و شرفِ ذات کا انھیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و اقرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں اور ہاتھ سے کام لیتے وقت کچھ بھی یاد نہیں رکھتے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ) خبردار! یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔ منعِ خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ پاسِ عزت نہ رکھنے، ناموس کی نگہداشت نہ ضروری سمجھنے . . . . کی وجہ سے ان کی تو اصل تک محفوظ نہیں۔ یہ تو صریح بد اصل ہیں۔
>
> (الہلال بابت ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء)

آپ گذشتہ اڑھائی سال کے کوائف و حوادث پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ جو کچھ ان کے متعلق اوپر کی سطور میں کہا گیا ہے اس کا ایک ایک حرف ان پر صادق آتا ہے یا نہیں۔

یہ ہے وہ وحشی اور دنی الطبع قوم جس سے شومئی قسمت سے، ہمارا دُہرا واسطہ ہے۔ ایک تو ہمسایہ ملک ہونے کی جہت سے اشتراکِ در و دیوار۔ اور دوسرا (اور یہ مسئلہ پہلے سوال سے بھی زیادہ اہم ہے) ان چار کروڑ مسلمانوں کا معاملہ جو ان درندوں کے قبضہ میں ہیں۔ انھوں نے ان غریب و ناتواں مسلمانوں پر جس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا ہے

تاریخ عالم کی سبعیت و بربریت کی داستانوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مسئلہ سے ہمارا صرف اسی قدر تعلق ہے کہ دنیا کی ایک سلطنت اپنی رعایا کے ایک حصہ پر ظلم و ستم روا رکھ رہی ہے! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کا نام لینے والوں کے لئے صرف اتنی سی بات بھی ان کی تلواروں کو نیام سے باہر لے آنے کے لئے کم نہیں۔ اس لئے کہ دنیا کے کسی گوشہ سے مظلوم کی فریاد اٹھے۔ اس پر لبیک کہتے ہوئے اس کی آگ میں کود پڑنا مسلمان کے فرائض زندگی کا جزو ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ یہاں ان چار کروڑ کمزور و ناتواں انسانوں کو محض اس جرم کی پاداش میں ستایا جا رہا ہے کہ قالوا ربنا اللہ۔ ہمارا اور ان کا رشتہ، انسانیت کے رشتہ کے علاوہ ہم آہنگی اور یک نگہی کا وہ عمیق رشتہ بھی ہے جس نے انہیں اور ہمیں ایک "ملتِ واحدہ" بنا دیا ہے۔ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے قوانین کی رو سے ان کی آئینی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، ہم اور وہ ایک ہی ملت کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ اس ذات اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کے ارشاد کے مطابق کہ جن کی رسالت پر ایمان لانے سے ہم ایک متمیز ملت قرار پاتے ہیں، ہمارا اور ان کا رشتہ جسدِ واحد کا رشتہ ہے کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک پڑیں اور سارے جسم پر راحت اور نیند حرام ہو جائے۔ اگر آپ اتنی دور نہیں جانا چاہتے تو کم از کم اس دلیل ہی کو یاد کرو کہ جس پر ہمارے دعوئے پاکستان کی بنیاد تھی، اور وہ دلیل اس کے سوا کیا تھی کہ

بناءِ ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

لہٰذا اگر ملتِ اسلامیہ کی جداگانہ قومیت کا مدار وحدتِ دین ہے تو آج ہندوستان کے چار کروڑ مظلوم و ناتواں مسلمانوں میں اور ہم میں وہ دینی وحدت بدستور قائم ہے۔ اس لئے وہ آج بھی اسی طرح ہماری ملت کا ایک حصہ ہیں جس طرح تقسیم ہند سے پہلے جسدِ ملت کا ایک عنصر تھے۔ پھر کیا ہے کہ آج ان کی مصیبت پر ہمارے لئے خواب و خور حرام نہیں ہو جاتا اور ان کی آہ و پکار ہمارا آرام اور چین ہم سے چھین نہیں لیتی؟

یاد رکھئے! اس اہم مسئلہ کا حل اول و آخر مسلمانانِ ہند کے پاکستان کی طرف منتقل ہو کر آ جانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ آپ ہندو سے ہزار آئینی ضمانتیں لے لیجئے۔ اس کی مسلم دشمنی اور کمینگیٔ فطرت وہاں کے مسلمانوں کو کبھی چین کی نیند سونے نہ دے گی۔ اس لئے اس حقیقت کو ہمیں ہمیشہ کے لئے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معاملہ اسی طرح سے حل ہو کر رہے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے معاملات کے لئے بین الاقوامی اداروں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن اول تو ان اداروں کی حیثیت اور پھر ان کی نیت ظاہر ہے۔ دوسرے یہ کہ

اس کی کیا ضمانت ہے کہ جب تک اس دعوے کا فیصلہ کوئی بین الاقوامی ادارہ کرے گا، ہندوستان کا مسلمان ختم نہ ہو چکا ہوگا! لہذا اس مسئلہ کا حل عدالتوں کے کٹہروں میں نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں ہی میں ہو سکے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان جنگ کی آگ بھڑکانے سے آخری وقت تک احتراز برتے گا جیسا کہ اب تک باوجود اشتعال اس نے احتراز برتا ہے۔ اور حتی الامکان کوشش کرے گا کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے پا جائے کیونکہ اسلام جنگ کی خاطر جنگ نہیں کرتا بلکہ وہ جنگ کو مٹانے کی خاطر جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان ایسے حالات پیدا کرنے سے قطعاً نہیں باز آئے گا جس سے جنگ ناگزیر ہو جائے! لہذا اگر نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ ہندوستان اس مسئلہ یا کسی اور مسئلہ پر جنگ کی طرح ڈال دے اور ہمیں لڑنے پر ہی مجبور کر دے تو قائد اعظم کے الفاظ میں ہماری روش یہ ہونی چاہئے کہ ہم امن کے مدعی ہیں اور جنگ کو پسند نہیں کرتے لیکن اگر تم لڑنے پر ہی آمادہ ہو تو ہم بھی تیار ہیں۔ ایسی مجبوری کی صورت میں حکومت کی تمام افواج اور جملہ سامان حرب تحفظ ملک کے لئے وقف ہوگا۔ لیکن حکومت کے علاوہ ہمیں بھی جنگ کی ناگزیر صورت میں اس حقیقت کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ جنگ میں فتح و شکست کا انحصار میدان میں لڑنے والی فوجوں پر ہی نہیں ہوا کرتا بلکہ اس ملکی آبادی (Civil population) پر بھی ہوا کرتا ہے جو ان فوجوں کے پیچھے شہروں اور بستیوں میں رہتی ہے۔ جس ملک کی شہری آبادی، عزم و استقامت اور ہمت و حوصلہ میں بڑھ جائے گی فتح و کامرانی اسی کے حصہ میں لکھی جائے گی۔ اور عزم و استقلال اور ہمت اور حوصلہ، دکانوں پر بکا نہیں کرتا کہ ضرورت کے وقت اٹھے اور خرید لائے۔ اس کے لئے عمر بھر کی محنت درکار ہوتی ہے۔ وہ محنت جس سے انسانی سیرت و کردار کو خاص سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے۔ جو قوم کردار کی بلندی نہیں رکھتی وہ کسی سے اپنا وزن محسوس نہیں کرا سکتی!

اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ مسلمانانِ ہندوستان اضطراری حالت میں پاکستان میں پناہ ڈھونڈیں گے۔ ان کا زندہ پاکستان پہنچ جانا از بس غنیمت ہوگا۔ یہ سوچ لیجئے کہ ان کے اس بے سروسامانی سے آ جانے سے آپ پر بوجھ پڑے گا۔ یہ سوچ لیجئے کہ آپ کو ان کا خیر مقدم کرنا ہوگا اور ان کو امن و عافیت سے رکھنے کا بندوبست بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت ان کی بحالی اور آبادکاری پر مقدور بھر کوشش کرے گی لیکن حکومت آخر جو کچھ کرے گی وہ اسی پاکستان کی حدود کے اندر کرے گی، اور آپ ہی کے تعاون سے کرے گی لہذا آپ اچھی طرح سوچ لیجئے اور اس کے لئے تیار ہو جائیے کہ آپ کو ان مہاجرین کو اپنی معاشرہ میں مناسب جگہ دینا ہوگی۔ اور یہ بھی سوچ لیجئے کہ یہ مظلومین جو کل تک آپ کے بھائی اور رفیق تھے آج بھی بدستور

آپ کے بھائی اور رفیق ہیں۔ اور یہ بھی سوچ لیجئے کہ آپ امن وعافیت سے پاکستان میں رہ رہے ہیں تو آپ کی اس پناہ گاہ کی تعمیر و تشکیل میں ان مظلومین کی مخلصانہ کوششوں کا بھی قابل قدر حصہ ہے۔ اور یہ بھی سوچ لیجئے کہ اگر یہ پناہ گاہ آپ کو حاصل نہ ہو چکی ہوتی تو آپ کا حشر بھی ایسا ہی ہوتا بلکہ اس سے بدتر۔ لہذا ان امور کو نگاہ میں رکھئے اور اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ، محسوس کر لیجئے تاکہ وقت آپڑنے پر آپ ان سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو سکیں۔ اس سبکدوشی کے لئے ضرورت ہے پیش نظر مسائل کے مکمل شعور کی اور مکمل اجتماعی نظم وضبط کی۔ اگر آپ اس راز کو نہ پا سکے اور قومی زندگی کو اس کے مطابق نہ ڈھال سکے تو آپ مسلمانانِ ہندوستان کا تو کیا اپنا تحفظ بھی نہیں کر سکیں گے۔

۱۔ **معراج انسانیت**۔ یعنی سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینہ میں۔
قیمت بیس روپے

۲۔ طلوعِ اسلام کا آئندہ پرچہ **اقبال نمبر** ہوگا۔

۳۔ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ صرف چھ روپے کر دیا گیا ہے۔ ایک پرچہ کی قیمت آٹھ آنے۔

سلیم کے نام . . .

(کمیونزم ۲)

پرویز

جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے، سلیم! میں نے کمیونزم کے متعلق تمہیں گذشتہ جولائی میں لکھا تھا۔ تم نے چھ ماہ کے بعد اس کے متعلق پھر ذکر کیا۔ لیکن مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات سمجھنے کے لئے اب انداز ٹھیک اختیار کیا ہے۔ اگر بات کو قرینے سے سلجھایا جائے تو اس کے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی۔

تم کہتے ہو کہ کمیونزم کے دو اجزا ہیں۔ ایک تو وہ فلسفہ جس کی ابتدا ہیگل نے کی اور اس کی بنیادوں پر مارکس نے عمارت بلند کی اور دوسرا جزو وہ معاشی نظام ہے جسے لینن نے ڈھالا اور سٹیلن اور اس کے رفقائے کار نے روس میں نافذ کیا۔ تم کہتے ہو کہ بحث صرف اس معاشی نظام تک محدود رکھنی چاہئے جس کا تجربہ روس میں ہو رہا ہے۔ اس فلسفہ کو الگ رکھ دینا چاہئے جس پر وہ نظام متفرع ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح بات زیادہ واضح ہو سکے گی تو یونہی سہی۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ تم کسی کمیونسٹ سے بات کرو تو وہ مارکس کے فلسفے اور روس کے معاشی نظام، دونوں کے مجموعہ کا نام کمیونزم قرار دے گا۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ کیونزم جس نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اس فلسفۂ زندگی کے بغیر، جس کی وہ پیداوار ہے، باقی رہ ہی نہیں سکتی، دوسری طرف اسلام کا معاشی نظام بھی اس کے فلسفۂ زندگی سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسلام کا نظام ایک ایسا کل ہے جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ایک جسم نامی کی طرح ایک دوسرے میں یوں سموئے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو باقیوں سے الگ کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کل کے متعلق کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا، اس ایک جزو کو بھی صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

بایں ہمہ، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اگر تم معاشی نظام کو اس کے فلسفہ سے الگ کر کے ہی سمجھنا چاہتے ہو تو یونہی سمجھنے کی کوشش کرو۔ بالخصوص اس لئے کہ تمہاری یہ بات مجھے خوش آئی کہ "یہ کیا دلیل ہوئی کہ چونکہ روس کا کمیونسٹ خدا کا قائل نہیں اس لئے وہاں اشتمالی طریقِ زراعت قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔" معلوم نہیں تمہارے سامنے یہ دلیل کس نے پیش کر دی۔ لیکن تمہارے طرز کی شوخی اس کی حقدار ہے کہ تمہاری تسکینِ خاطر کا سامان اسی انداز سے بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

تم کہتے ہو کہ اسلامی نظامِ معاش اور اشتراکی نظام میں فرق صرف یہ ہے کہ اسلامی نظام ذاتی ملکیت ضروری قرار دیتا ہے اور اشتراکی نظام میں اس کی نفی ہوتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان ہر دو نظامہائے معیشت میں "صرف یہی فرق" ہے یا کچھ اور بھی، میں پوچھتا ہوں کہ جس فرق کو تم نے "صرف یہ فرق" کہکر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا ہے کہ اس طرح اسلامی نظام اشتراکی نظام کے بہت قریب آجاتا ہے، کیا وہ فرق تمہارے نزدیک ایسا ہی معمولی فرق ہے کہ اسے اس طرح نظر انداز کر دیا ہے؟ سلیم میاں! تم تو اچھی وزندار باتیں کیا کرتے تھے۔ تم نے سوچا ہی نہیں کہ یہ تم نے کیا کہدیا؟ عزیزم! یہ ذاتی ملکیت جو دنیا میں نظام سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ تم اگر غور سے دیکھو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سرمایہ داری اور اشتراکی نظام میں ما بنیادی فرق ہی "ذاتی ملکیت" کا ہے۔ جب تم "ذاتی ملکیت" کا اصول مان لو تو اس ملکیت کی تحدید (حدبندی) ترک نہیں جا سکتی۔ اور ذاتی ملکیت بلا تحدید کا دوسرا نام سرمایہ داری ہے۔ اور جب سرمایہ داری، ذاتی ملکیت ہی کی پھیلی ہوئی شکل کا دوسرا نام ہے تو ذاتی ملکیت اور اشتراکی نظام ایک دوسرے کے نقیض ٹھہرے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ذاتی ملکیت کو ضروری قرار دینے والے نظام اور اشتراکی نظام میں فرق صرف "ذاتی ملکیت" ہی کا ہے، باقی ہر طرح سے وہ دونوں ایک ہیں، ایک بہت بڑی جہالت یا خود فریبی کا ثبوت دینا ہے۔ تم سے تو مجھے اس کی توقع نہ تھی! تم اس سے لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہو گے کہ پھر تو اسلام کا معاشی نظام اور اشتراکیت کا نظام فی الواقعہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا اگر ان کے فلسفہ سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو بھی یہ ایک دوسرے کے قریب نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

یہی دلیل ہے سلیم! جو آج کل عام طور پر اسلام اور اشتراکیت کے تقابل میں پیش کی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ذاتی ملکیت کو فی الواقعہ ضروری قرار دیتا ہے؟ یہ بات سمجھ لینے سے باقی تمام باتیں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔

اسلام میں، سلیم! ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب تم پھر کہدو گے کہ میں نے ایک اور دنیا جہان سے نرالی بات کہدی۔ لیکن قرآن کی ہر بات آج نرالی سمجھی جاتی ہے اس لئے کہ مسلمان کے سامنے اور سب کچھ ہے بجز قرآن کے۔ لہٰذا اس کے سامنے جب کبھی کوئی بات قرآن کی آئے گی تو وہ اسے نامانوس نظر آئے گی اور وہ محسوس کرے گا کہ یہ تو کچھ نرالی سی بات ہے۔ لیکن اس میں قرآن کا تو قصور نہیں۔ قصور تو اس ذہنیت کا ہے جو ہر غیر قرآنی تصور کو اسلامی سمجھ چلی آرہی ہے اور ہر قرآنی تصور اس کے نزدیک یکسر غیر اسلامی ہے۔

سلیم! اگر غور سے دیکھو تو معاشی نظام کا مسئلہ درحقیقت صرف اس قدر ہے کہ فرد اور جماعت کا باہمی تعلق کیا ہے ان کے حقوق و واجبات کے دوائر کیا ہیں؟ قرآن کریم نے اس تمام مسئلہ کو ایک آیت میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر اس آیت کا صحیح مفہوم "آن سے متعین کر لیا جائے تو وہ تمام الجھاؤ خود بخود صاف ہو جاتے ہیں جنہوں نے اس وقت مختلف قلوب و اذہان کو

اسی طرح پریشان کر رکھا ہے۔ قرآن نے ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کی بنیاد اس آیۃ مقدسہ پر رکھی ہے جس میں فرمایا ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ نے مومنین کی جان اور مال خرید لئے ہیں اور اس کے بدلے میں انھیں جنت عطا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے۔

یہ آیت اُس معاہدہ (Agreement) کی اصل ہے جس پر اسلامی نظام اجتماعیہ کی فلک بوس اور آفاق گیر عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس معاہدہ میں دو فریق ہیں۔ ایک فریق **اللہ** اور دوسرا فریق **مومن**۔ اور دو چیزیں ہیں۔ ایک چیز جو بیچی جاتی ہے اور دوسری چیز اس کی قیمتِ فروخت ہے۔ مسلمانوں نے جب سے "اللہ" کو عرش پر بٹھا رکھا ہے اور جنت کو صرف اگلے جہان سے متعلق کر رکھا ہے، اسوقت سے قرآن کے دیگر محکمات و بینات کی طرح اس معاہدہ کا مفہوم و منطوق بھی چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن سلیم! غور کرو۔ اگر اللہ کو صرف ایک عقیدہ کے طور پر مانا جائے اور اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ متعین نہ ہو سکے، اور جنت کے متعلق بھی اسی طرح صرف ایک عقیدہ ہی رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس عظیم القدر معاہدہ میں ایک فریق (یعنی فروخت کرنے والا۔ مومن) اور ایک شے (فروخت کردہ چیز ۔۔۔ اموال و نفوس) تو محسوس و مشہود ہوں گے اور فریقِ ثانی (یعنی خریدار ۔۔۔ اللہ) اور قیمتِ فروخت (جنت) محض تصوراتی۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا معاہدہ یا بیع و شریٰ کا معاملہ بھی سننے میں آیا ہے؟ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ جہانتک مسئلہ زیرِ نظر کا تعلق ہے، پہلے آیۃ زیرِ بحث میں اللہ اور جنت کا مفہوم متعین کر لیا جائے تاکہ بات واضح ہو جائے۔

اللہ کی ذات کے متعلق سلیم! انسان کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ معاملہ انسانی شعور و ادراک کی حد سے ماوراء ہے۔ اگر حقیقت یہ ہے تو پھر ہمارا اور اللہ کا تعلق کیا ہے؟ یہ بحث بہت تفصیل طلب ہے۔ اس کے لئے تمہیں کچھ عرصہ اور انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت اس وسیع و ہمہ گیر موضوع کے صرف ایک گوشہ کو سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ جہانتک ہماری موجودہ زندگی اور اس کے معاملات کا تعلق ہے، ہمارا واسطہ اللہ کے قانون سے ہے۔ اس ضمن میں، اگر سلیم! تم ایک اہم نکتہ کو سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا یعنی ان مقامات میں اللہ کی جگہ اگر تم "اللہ کا قانون" کہہ لیا کرو تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ مثلاً "اللّٰہ یُحیی و یُمیت" کا ترجمہ ہے "اللہ ہی مارتا ہے اور وہی جلاتا ہے"۔ اسے سمجھنے کے لئے تم یہ کہہ لیا کرو کہ "اللہ کا قانون مارتا ہے اور وہی زندہ رکھتا ہے" یعنی زندگی اور موت قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل و متعین ہوتی ہے۔ یا "اللہ رزق دیتا ہے" یعنی رزق اللہ کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ "اللہ ہی بیمار کرتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے"۔ یعنی بیماری اور شفا اللہ کے قانون کے مطابق واقعہ ہوتی ہے۔ "ہر کام کا اجر اللہ دیتا ہے"۔ یعنی ہر کام کا نتیجہ اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ "رنج و راحت سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں"۔ یعنی مصیبت اور راحت سب قانونِ خداوندی کے مطابق ملتی ہے۔ یا "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" یعنی اللہ کا

قانون ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

اب سلیم! ایک قدم اور آگے بڑھو۔ "اللہ کا قانون" ایک تو وہ ہے جو آفاقی کائنات میں ہر شے کو محیط ہے اور جس کے مطابق یہ تمام نگارخانہ ہست و بود اس حسن و رعنائی سے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔ اور اس قانون کا دوسرا حصہ وہ ہے جو قرآن کی دفتین میں نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے محفوظ ہے۔ آفاقی قانونِ خداوندی، از خود ہر جگہ نافذ العمل ہے کیونکہ کائنات میں کسی شے کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ لیکن دنیائے انسانیت میں خدا کا قانون، انسانوں کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوگا کیونکہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کا نام ہے ملتِ اسلامیہ جس کا فریضۂ حیات، قانونِ خداوندی کا نفاذ ہے۔ لہٰذا جب انسانی دنیا سے متعلق قانونِ خداوندی کا ذکر ہوگا تو وہاں "اللہ" سے مراد ہوگا ملت کا وہ اجتماعی نظام جو اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد قرآن کے بہت سے اور گوشوں کا مفہوم بھی بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ "کُونُوٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ" تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تو انسانوں کی مدد کا محتاج نہیں۔ اس لئے اس کے معنی واضح ہیں کہ افرادِ جماعت کو چاہئے کہ وہ اپنے نظامِ اجتماعیہ کی مدد کریں جو خدا کا قانون عملاً نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یا مثلاً وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ "اللہ کو قرضِ حسنہ دو" سو اللہ تو کسی کے قرض کی احتیاج نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا مفہوم واضح ہے کہ افرادِ جماعت پر لازم ہے کہ وہ اپنا مال نظامِ اجتماعیہ کے سپرد کر دیں تاکہ وہ ملت کے کمزور گوشوں کی کمی پوری کر کے اس میں توازن قائم رکھ سکے۔ (حسناً سے یہی مفہوم ہے)۔

ان تصریحات سے سلیم! تم یہ سمجھ گئے ہو گے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ کے معاہدہ میں فریقِ اول۔ یعنی اللہ۔ سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد ہے ملت کا وہ نظامِ اجتماعیہ جو دنیا میں قانونِ خداوندی نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یعنی یہ آیۂ جلیلہ درحقیقت، ملت اور افراد کے باہمی تعلق کا منشور ہے۔ اس معاہدہ میں فریقین کا تعین ہو گیا۔ اب بیع و شری کی اشیاء کی طرف آیئے۔ اس معاہدہ کی رو سے افراد یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ اپنا مال (یعنی ماحصلِ اکتساب) اور جان (یعنی عطایائے خداوندی) ملت کے حوالے کرتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں ملت، ان کے لئے جنت کی ذمہ دار بنتی ہے۔

جس طرح ہم نے اس معاہدہ میں اللہ کے صحیح مفہوم کا تعین کیا ہے اسی طرح جنت کا مفہوم متعین کرنا بھی ضروری ہے۔

جس طرح مسلمانوں نے اللہ کو عرش پر بٹھا رکھا ہے، اسی طرح انہوں نے جنت کو بھی دوسری دنیا کے ساتھ مختص کر رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس خط میں، اس اہم موضوع کے

متعلق بھی میں تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکونگا۔ جنت، دوزخ، قیامت، الساعت، بعثت، میزان، سب اسی اہم موضوع کے غور طلب گوشے ہیں۔ جب سلیم! قرآن کی روشنی میں ان گوشوں سے پردے اٹھیں گے تو تمہارے سامنے ایک نئی دنیا آجائیگی۔ اور اس وقت تم قرآن کی عظمت اور رفعتِ حقائق پر وجد کروگے۔ اس کے لئے معارف القرآن کی آخری جلد کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب نظامِ زندگی، قانونِ خداوندی کے مطابق استوار ہو کر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں توازن قائم کردے تو اس سے انسانیت کا قیام ظہور میں آجاتا ہے اور اس سے سطحِ ارضی پر جنت کی بساط بچھ جاتی ہے۔ یہ اس دنیا کی جنت ہے۔ اور چونکہ سلسلۂ حیات غیر منقطع طور پر آگے بڑھتا ہے اس لئے اس جنت کی وسعتیں، طبعی موت کے بعد کی زندگی کو بھی محیط ہوجاتی ہیں۔ اس جنتِ ارضی کی تفاصیل قرآن کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے موضوعِ زیرِ نظر کے اعتبار سے اس کی اہم شقیں یہ ہیں کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸) اس میں کسی کو بھوک پیاس، لباس اور مکان کی تکلیف نہ ہوگی۔ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) نہ اس میں مشقت اور تکلیف ہوگی، نہ افسردگی اور پژمردگی۔ خوف اور حزن بھی نہیں (۲/۳۸) ہر طرح سے سلامتی ہی سلامتی ہوگی۔ (۵۶/۲۶)۔ لہٰذا ارضی جنت اس اسلوبِ حیات کا نام ہے جس میں زندگی کی تمام ضروریات بغیر کسی ذہنی واماندگی اور کبیدگیٔ خاطر کے میسر آتی رہیں۔ اپنی حفاظت کی طرف سے کامل اطمینان ہو اور ہر شخص کے فطری جوہروں کی نمود وارتقا کے سامان مہیا ہوں۔ یہ ہے جنت سے مفہوم۔

اب سلیم! تم اس قرآنی معاہدہ پر پھر غور کرو۔ افرادِ ملت، اپنی اکتسابی اور وہبی استعدادوں کے ماحصل کو نظامِ اجتماعیہ کے سپرد کردیتے ہیں اور نظامِ اجتماعیہ ان کے خورونوش، مکان، لباس، حفاظت اور نشوونما وارتقا کے دیگر ضروری اسباب و ذرائع کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ ان افراد کی اپنی ضروریات بھی اور ان کے بچوں کی بھی۔ کیونکہ "جنت" میں ان کے ساتھ ان کی ذریت بھی شامل ہوتی ہے (والذین اٰمنوا واتبعتہم ذریتہم بایمان الحقنا بہم ذریتہم۔ (۵۲/۲۱)) اب اس نظام کی ترتیب یوں ٹھہری کہ اس میں شامل ہونے والے تمام افراد کی جملہ ضروریاتِ زندگی اور اسبابِ نشوونما وارتقا کی ذمہ داری، اس نظام نے لے لی، اور مختلف افرادِ ملت کے سپرد، ان کی استعداد کے مطابق، مختلف کام کردیئے۔ کسی کے سپرد زمین کا ٹکڑا کردیا کہ وہ ہل جوتے۔ کسی کو صنعت و حرفت کے کسی شعبے میں لگا دیا۔ کسی کی تحویل میں مبادلۂ اشیائے ضروریہ دیدیا۔ کسی کو تعلیم و تربیت کا نگران مقرر کردیا۔ کسی کے ذمہ نظم و نسق ہیئتِ اجتماعیہ (کاروبارِ حکومت) لگا دیا۔ اربابِ فکر و نظر کو مصالحِ ملی اور انسانیت کے مستقبل کی تدابیر سونپ دیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اب یوں سمجھو کہ مثلاً ایک شخص نے ایک دن میں پانچ روپے کا کام کیا ہے اور اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے دس روپے درکار ہیں۔ تو نظامِ اجتماعیہ جس نے اس کی "جنت" کا ذمہ لے رکھا ہے

اسے پانچ روپے اور دے گا۔ اور اس امداد کے لئے یہ شخص کسی طرح بھی زیر بارِ منت نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ اس معاہدہ کی رو سے جو اس نے اس نظام سے کر رکھا ہے اس کمی کے پورا کئے جانے کا حقدار ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص نے دن بھر میں دس روپے کا کام کیا ہے اور اس کی ضروریات کے لئے پانچ ہی روپے کفایت کرتے ہیں تو بقایا پانچ روپے (جسے قرآن نے العفو کہا ہے) نظامِ اجتماعیہ کی ملکیت ہیں۔ کیونکہ اس فردِ کاسب نے اپنا تمام مال اس نظام کے ہاتھوں بیچ رکھا ہے۔ اب اگر ضروریاتِ اجتماعی کا تقاضا ہے کہ اس فاضلہ رقم کو نظامِ اجتماعیہ اسی وقت اپنی تحویل میں لے لے تو وہ رقم فوراً ان کی طرف منتقل ہو جائیگی لیکن اگر اس کی فوری ضرورت نہیں تو یہ بطورِ امانت اس شخص کی تحویل میں رہے گی۔ اب ظاہر ہے کہ امانت کو کسی صورت میں بھی ملکیت نہیں کہا جا سکتا۔

کہو سلیم! اس نظام میں ذاتی ملکیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ العفو (ضروریات سے فاضل) بطورِ امانت فردِ متعلقہ کی تحویل میں رہ سکتا ہے۔ اب یہ چیز اس نظام کے اختیار میں ہے کہ اس تحویل کے لئے جس قسم کے قواعد و ضوابط چاہے متعین کر دے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب قرآن کریم میں وصیت کا حکم اور تقسیم وراثت تک کا قانون موجود ہے تو پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ کہ قرآنی نظامِ اجتماعیہ میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے کچھ تو ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا لیکن سردست یہ سمجھ لو کہ جب اجتماعی مصالح، العفو (ضروریات سے فاضلہ مال) کو فردِ متعلقہ کی تحویل میں رکھنا چاہیں تو العفو، اس فردِ متعلقہ کی موت کے بعد دوسروں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ جن کی طرف منتقل ہوگا وہ بھی اسی نظام کے اجزا ہوں گے اور انھوں نے بھی اسی طرح اللہ سے معاہدہ کر رکھا ہوگا جس طرح متوفی نے کر رکھا تھا۔ لہذا جس شکل میں یہ مال متوفی کی تحویل میں تھا اسی شکل میں اس کے اخلاف کی تحویل میں رہے گا۔ یہ تو رہا مال کے متعلق۔ باقی رہے ذرائع پیداوار (مثلاً کاشتکار کی صورت میں زمین، یا صناع کی صورت میں آلات و اوزار وغیرہ) تو جس طرح ایک ملازم حکومت، اپنے ریٹائر ہوتے وقت، اپنی میز کرسی، قلم دوات کو فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہوتا، اسی طرح یہ افرادِ کاسب، ان ذرائع پیدائش کو بیچنے کا مجاز نہیں ہو سکتے۔ یہ ذرائع و اسباب نظامِ اجتماعیہ کے قواعد کے مطابق ان لوگوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے جو انھیں بغرض پیداوار کام میں لا سکیں۔

پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں بیشمار آیات ایسی ہیں جن میں انفاق فی سبیل اللہ (خیرات وغیرہ) کیلئے ترغیب و تحریص دلائی گئی ہے۔ اگر افرادِ ملت، اپنے معاہدہ کی رو سے، اپنے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کے پاس فروخت کر چکے ہوں اور ان کی ضرورت سے زائد مال، ان کی تحویل میں محض بطورِ امانت رکھا جانا مقصود ہو تو اس امانت کی بازیابی کے لئے ترغیب و تحریص کی کیا ضرورت ہے۔ نظامِ اجتماعیہ جب جی چاہے اس امانت کو واپس بلا لے۔ ترغیب و تحریص کے تو ظاہر ہے

کہ یہ مال افرادِ متعلقہ کی ملکیت ہے اور نظامِ اجتماعیہ اسے ان کی مرضی کے خلاف ان سے لے نہیں سکتا۔

یہ اعتراض واقعی ایک شبہ پیدا کرتا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس معاہدہ کی رو سے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، افرادِ ملت صرف اپنا مال ہی ملت کے ہاتھوں نہیں بیچتے بلکہ اپنی جانیں بھی بیچ دیتے ہیں۔ جس سے لامحالہ یہی مفہوم ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت یہ تمام افراد سپاہیانہ حیثیت سے فوج کی صفوں میں آجائیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اسلامی نظامِ اجتماعیہ میں تمام مسلمان (اپنے اس معاہدہ کی رو سے) فوج کے سپاہی ہوتے ہیں۔ اس میں انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ میں شمولیت کے لئے بھی آیاتِ ترغیب و تحریص کی کمی نہیں۔ جس طرح انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ترغیب دلائی گئی ہے اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھی تحریص و تشویق کی صورت اختیار کی گئی ہے۔ لہٰذا اگر ترغیب و تحریص کی آیات سے بالکلیہ یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ معاملہ افرادِ ملت کے اختیار پر چھوڑ گیا ہے تو مومنین کے لئے فوجی خدمت بھی اختیاری رہ جائیگی۔ حالانکہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ فوجی خدمت ہر فردِ مومن پر لازم ہوتی ہے۔ ہر مومن خدا کا سپاہی ہوتا ہے اور ہر وقت جہاد کے لئے تیار۔ لہٰذا اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ محض آیاتِ ترغیب و تحریص کی موجودگی اس پر مستلزم نہیں کہ نظامِ اجتماعیہ مومنین کے مال و جان میں تصرف کا حق نہیں رکھتا کیونکہ یہ افراد کی ملکیت ہوتے ہیں۔

آیاتِ ترغیب و تحریص سے، سلیم! دو باتیں مقصود ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن اُن حالات کو بھی سامنے رکھتا ہے جن میں ہنوز نظامِ اجتماعیہ اپنی مکمل شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔ ان حالات میں جب وہ ابھی اس قابل نہ ہو کہ افرادِ ملت کو "الجنۃ" دے سکے یعنی ان کی تمام ضروریاتِ زندگی اور سامانِ نشوونما کی کفالت کر سکے تو وہ افرادِ ملت کا مال اور جان خریدتا نہیں۔ کیونکہ جب وہ ان کی قیمت ہی ادا نہیں کر سکتا تو انہیں خریدے گا کیسے؟ جب وہ معاہدہ کی وہ شق جو اس سے متعلق ہے پوری کرنے کی ہنوز استطاعت نہیں رکھتا تو وہ معاہدہ کرے گا ہی نہیں۔ ان حالات میں اموال و نفوس افراد کی ملک میں رہیں گے اور انہیں اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ان کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکے گا۔ اس کے لئے ترغیب و تحریص کی ضرورت ہوگی۔ یعنی انہیں یہ بتلانے کی کہ اگرچہ سردست انہیں، ان کے اموال و نفوس کی قربانی کے بدلے میں کوئی مشہود معاوضہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر وہ ان دیکھے نتائج پر یقین رکھیں (جسے ایمان بالغیب کہتے ہیں) تو ان کا انفاق و جہاد فی سبیل اللہ، اس نظامِ اجتماعیہ کے قیام کا ذریعہ بن جائے گا جس کا فطری نتیجہ "الجنۃ" ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جنتِ ارضی ان کی اپنی زندگی میں سامنے آجائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ درخت ان کے بعد ثمر بار ہو اور ان کی آنے والی نسلیں (یعنی آنے والی انسانیت) اس جنت کی زندگی سے متمتع ہو سکیں۔ لہٰذا ترغیب و تحریص کی آیات، یا وصیت و میراث کے احکام، اسی عبوری دور سے متعلق ہیں۔ ورنہ جب افرادِ ملت اور نظامِ اجتماعیہ میں بیع و شریٰ کا وہ معاہدہ مکمل ہو جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے تو جب تک وہ معاہدہ قائم رہے گا فریقین پر اس کی

پابندی لازم آئے گی۔

یہ تو رہا سلیم! اس مسئلہ کا خارجی پہلو۔ لیکن اگر اس کے نفسیاتی پہلو کو دیکھا جائے تو معاہدہ کے باوجود، اس ترغیب و تحریص کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس ضرورت کو سمجھنے کے لئے، اس کے چند ایک مبادیات کو سامنے لانا ضروری ہے۔ میں سلیم! جانتا ہوں کہ تم خشک موضوعات سے جلد گھبرا جایا کرتے ہو اور نفسیات تمہارے لئے ہمیشہ "عبوسًا قمطریرا" کا حکم رکھتا ہے (خدا کرے کہ تم اس کے "تروتازہ" گوشے سے بہرہ یاب ہونے کی صلاحیت پا سکو)۔ اس لئے میں کوشش کروں گا کہ اس کے اصطلاحی پہلوؤں سے درگذر کرتے ہوئے تمہاری زبان میں ہی بات سمجھا سکوں اگرچہ اس اسلوب کا نباہنا مشکل ہوا کرتا ہے۔ بہرحال ذرا غور سے سمجھنے کی کوشش کرو۔

حیوانات میں کسی ایک نوع کو لو۔ تم دیکھو گے کہ اس نوع کے افراد میں "کمانے" کی استعداد میں بہت کم فرق ہوگا (حیوانوں میں "کمانے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے مقصود ان کی اپنی طبعی ضروریات کے پورا کرنے کی صلاحیت ہے) مثلاً جنگل کے ہرنوں کو دیکھو۔ (بیمار وغیرہ کو چھوڑ کر) تمام ہرن پیٹ بھرنے کے لئے گھاس چرنے کی صلاحیت یکساں طور پر رکھیں گے لیکن اس کے برعکس انسانوں کو دیکھو۔ مختلف افراد کی کسبی صلاحیتوں کا تفاوت ایک حقیقت باہرہ ہے۔ قرآن اسی استعداد کے فرق کو "فضلنا بعضھم علیٰ بعض" کے جامع الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی نے، کسبِ معاش کی استعداد کے معاملے میں بعض افراد کو دیگر افراد پر برتری عطا کر رکھی ہے۔ لہٰذا جب کسبِ معاش کی استعداد میں تفاوت ہے تو اس استعداد کے ماحصل یعنی "کمائی" میں بھی فرق ہوگا۔ یعنی ایک زیادہ کما سکے گا دوسرا کم۔ اور یہ واقعہ ہے۔

اب آگے بڑھو۔ جب ایک ہرن اپنا پیٹ بھرلے گا تو وہ درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ جائے گا اور سکھ کی نیند سوئے گا۔ اسے اس کی قطعاً فکر نہ ہوگی کہ جنگل کی گھاس کو دوسرے ہرن کھائے جا رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اسے ختم کر دیا تو وہ شام کو بھوکا رہ جائے گا۔ تم نے سلیم! اپنی گائے کو نہیں دیکھا؟ جب وہ پیٹ بھر کر جگالی کرنے بیٹھ جاتی ہے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی کہ باقی ماندہ چارہ کون لئے جا رہا ہے! اسے چارہ کا خیال پھر اس وقت آتا ہے جب اسے دوبارہ بھوک لگتی ہے۔ یعنی سیر ہو جانے کی صورت میں وہ سیر چشم بھی ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں انسان کو دیکھو۔ اس کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن نیت نہیں بھرتی۔ صبح کے کھانے سے ہنوز فارغ نہیں ہوتا کہ شام کی فکر ستانے لگ جاتی ہے۔ اور پھر کل کی۔ اور پرسوں کی۔ اور بڑھاپے کی اور پھر اپنے بعد اپنی اولاد کی۔ اور اولاد در اولاد کی۔ یہ سلسلۂ دراز عمر بھر اسے ستاتا رہتا ہے۔ یعنی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن نیت نہیں بھرتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان مآل اندیش واقع ہوا ہے اور مآل اندیشی کا تقاضا ہے کہ انسان دور اندیش ہو۔ کل کی فکر بھی کرے۔ لیکن یہ کل کی فکر،

پیٹ کی بھوک کے لئے ہی نہیں کرتا بلکہ بیشتر نیت کی بھوک کی خاطر کرتا ہے سلیم! تم نے ایسے لوگ دیکھے ہوں گے کہ ان کے پاس روپیہ جمع ہے کہ ان کی پشت ہا پشت تک کو بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بایں ہمہ وہ ہر وقت ھل من مزید کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اس نیت کی بھوک یعنی بے صبری کی تعبیر کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ "ان الانسان خلق ھلوعا" (۷۰/۲۰) یعنی انسان بہت بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اپنی پسندیدہ چیزوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے بڑا شدید جذبہ رکھتا ہے۔ اسی کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ انہ لحب الخیر لشدید۔ یہ سب کچھ سمیٹ لینے کی ہوس بھوک کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ ایک اور جذبہ کے ماتحت ہوتی ہے جسے قرآن نے تکاثر اور تفاخر کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ۔ منافست اور مسابقت کی خواہش۔ تفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد (۵۷/۲۰) اور یہ جذبہ قبر تک انسان کے ساتھ جاتا ہے۔ الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر (۱۰۲/۱) وہ جذبہ جس کے ماتحت اس کا مقصودِ حیات "جمع مالاً وّعدّدہٗ" (۱۰۴/۲) مال جمع کرکے اسے گنتے رہنے کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ تم دیکھو گے سلیم! کہ حیوانات میں باہمی مسابقت و منافست کا جذبہ کہیں کارفرما نہیں ہوتا۔ کوئی بکری یہ دیکھ کر نہیں کڑھتی کہ ہرن اس برق رفتاری سے کیوں دوڑ رہا ہے۔ یہ انسان ہی کی "خصوصیت" ہے اور اس کی وجہ وہی "بے صبرا پن"۔

اب سلیم! دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں۔

اول یہ کہ مختلف انسانوں میں کمانے کی استعداد و صلاحیت مختلف ہوتی ہے اس لئے ایک فرد دوسرے فرد سے زیادہ کمائی کر سکتا ہے۔

اور دوسرے یہ کہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جانے کے باوجود وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے۔

لہٰذا — جس کی کمائی اس کی ضروریات سے زائد ہوگی وہ اس فاضلہ مال کو سمیٹ کر رکھنے کی فکر کریگا۔ کسی دوسرے کو نہیں دیگا۔ اور پھر ہر وقت اس میں مزید اضافہ کی فکر کرتا رہے گا۔

یہ ہیں سلیم! وہ حقائق نفس الامری جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی موجودگی میں دنیائے انسانیت میں فساد رونما ہونا یقینی ہے۔ نہ آپ اکتسابی استعداد کے تفاوت کو مٹا کر تمام انسانوں کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ایک جیسا کمائیں۔ اور نہ ہی ان کے اس جذبہ سے چشم پوشی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص سمیٹنے کی فکر نہ کرے۔ مذہب نے اس "فتنہ" کا علاج یہ سوچا کہ انسانوں کو دنیا ترک کر دینے کی تعلیم دیجئے۔ نہ دنیا کی آرزو رہے اور نہ ان آرزوؤں سے پیدا شدہ فساد کا امکان۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ترک لذات۔ ترک خواہشات۔ ترک مقاصد۔ ترک دنیا (حتیٰ کہ صوفیاء کی اصطلاح میں "ترکِ ترک") یہ سوچا گیا اس کا علاج۔ نفس کشی یا خانے

ذاتِ انسانی" روحانیت" کا کمال تصور کر لیا گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ طریقِ علاج ہمارا بنایا ہوا نہیں تھا بلکہ انسان کا اپنا وضع کردہ تھا۔ اور چونکہ غیر فطری تھا اس لئے اس کا نباہ بھی ممکن نہ تھا۔ (ورھبانیۃ ابتدعوھا ماکتبنٰھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا۔ ۵۷ پ) اس طریقِ علاج (رہبانیت) کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا طلبی کا جذبہ "شر" (Evil) کی حیثیت رکھتا ہے اور شر کا استیصال روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اس جذبہ کے فنا کر دینے میں "نجات" پوشیدہ ہے۔ یہ مفروضہ یکسر باطل اور ایک بہت بڑے فساد کا باعث ہے۔ اگر سلیم! اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی فطرت میں بعض جذبات شر (Evil) کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں تو اس سے خالقِ فطرت کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس تصور کا سرچشمہ (بایکم از کم قریبی چشمہ) عیسائیت کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی گنہ گار ہوتا ہے۔ ہم اپنے موضوع زیرِ نظر سے دور نکل جائیں گے ورنہ میں تمہیں سلیم بتاتا کہ کائنات میں فی ذاتہٖ شر کا وجود ہی نہیں۔ منبعِ کائنات (الوہیاتی توانائی Divine Energy) یکسر خیر ہے لہٰذا اس کے مظاہر شر کیسے ہو سکتے ہیں؟ شر تو اس صورتِ حالات سے پیدا ہوتا ہے جس میں انسان اپنی قوتوں کے غلط استعمال سے اپنے نظام کا توازن بگاڑ دیتا ہے (اسی کو فساد کہتے ہیں)۔ یہی قوتیں جب توازن قائم کرنے میں صرف کی جائیں تو ان کا ماحصل خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ اصول یکسر غلط نگہی پر مبنی ہے کہ انسانی قویٰ اور جذبات میں سے بعض شر انگیز ہوتے ہیں اس لئے ان کی فنا میں انسان کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ انہی دو چیزوں کو لیجئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی اکتسابی صلاحیتوں میں تفاوت اور باہمی تکاثر و تفاخر۔ اگر ان خصوصیات و جذبات کو مٹا دیا جائے تو سوچو کہ انسانوں کی دنیا کیا بن کر رہ جائے۔ یہ دنیا پتھروں کی دنیا بن جائے یا جنگل کے حیوانات کی دنیا۔ جو لوگ ترکِ آرزو سے دنیا چھوڑ کر زاویوں اور خانقاہوں میں جا چھپتے ہیں، جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے، ان میں اور پتھروں میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ بجز اس کے کہ پتھر زمین کی چھاتی پر بوجھ ہوتے ہیں لیکن یہ زندہ پتھر دوسرے انسانوں کی چھاتی پر بوجھ۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن اس باب میں کیا کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان قویٰ و جذبات کو بے محابا چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ فساد ہی فساد ہوتا ہے اور انہیں فنا کر دیا جائے تو دنیائے انسانیت کی تمام ترقیاں یک قلم رک جاتی ہیں؛ قرآن اس باب میں ایک عجیب راہ اختیار کرتا ہے۔ (اور وہ کونسا باب ہے سلیم! جس میں وہ عجیب راہ اختیار نہیں کرتا!) قرآن ان جذبات کو نہ بے زمام چھوڑتا ہے اور نہ ہی انہیں فنا کرتا ہے۔ وہ ان کا رخ بدل دیتا ہے اور رخ کے بدل جانے سے ساری دنیا بدل جاتی ہے۔

سلیم! یہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ جہاں تک انسان اس اندیشہ کی وجہ سے مال جمع کرتا ہے کہ وہ وقت بے وقت اس کے کام آئے یا اگر اس کی موت بے وقت ہو جائے تو اس کی اولاد کس مپرسی کی حالت میں نہ رہ جائے، تو یہ اندیشہ اس نظام کے ماتحت خود بخود رفع ہو جاتا ہے جو اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریات کو اپنے ذمے لیتا ہے۔ چونکہ اس نظام کی عطا کردہ جنت

میں خوف وحزن کا نام نہیں۔ اب رہا ایک دوسرے سے مسابقت کا جذبہ۔ یعنی عزت کا خیال اور فخر کا جذبہ۔ قرآن اس باب میں فخر اور عزت کا معیار بدل دیتا ہے اور اس طرح مسابقت اور منافست کے لئے میدان عطا کر دیتا ہے۔ ذرا سورۂ حدید کی ان آیات کی طرف غور کرو، سلیم! جن کا ایک ٹکڑا اوپر دیا جا چکا ہے۔ فرمایا اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد۔ "اس حقیقت کو سمجھ لو کہ قریبی مفاد کی زندگی کھیل تماشا اور ظاہری زیبائش، باہمی تفاخر اور مال اور اولاد کیلئے تکاثر (ایک دوسرے پر کثرت رکھنے) کی زندگی ہے" کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما۔ بارش کی مثال کی طرح جس کا کھیتی کو اگانا کسانوں کو خوش آتا ہے۔ پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو وہ اسے ریزہ ریزہ شدہ دیکھتا ہے۔ وفی الاخرۃ عذاب شدید۔ اور ان کے لئے مستقبل میں شدید سزا ہے۔ ومغفرۃ من اللہ ورضوان۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں مغفرت اور رضوان ہے۔ وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ مفاد عاجلہ کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔ یعنی مفاد عاجلہ کے پیش نظر باہمی تکاثر و تفاخر کا جذبہ، اپنے اندر بظاہر بڑی کشش و جاذبیت رکھتا ہے لیکن یہ خوشگواری محض وقتی ہوتی ہے۔ انسانی زندگی جو ابدیت درکنار ہے، اس سے اپنے اندر نمود و ارتقا کا سامان نہیں پاتی۔

اب اس کے بعد قرآن یہ نہیں کہتا کہ یہ جذباتِ مسابقت و مفاخرت اس قابل ہیں کہ انہیں فنا کر دیا جائے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ مسابقت کے جذبات کی تسکین کے لئے ایک اور میدان ہے۔ آؤ اور اس میدان میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنا حوصلہ نکال لو۔ یہ میدان کونسا ہے۔ فرمایا سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السماء والارض اعدت للذین اٰمنوا باللہ ورسلہ۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہو تو اپنے نشوونما دینے والے سے، مانع نشوونما اسباب و علل سے پناہ چاہو اور حفاظت طلب کرنے میں اور اس جنت کے حصول میں جو پستیوں اور بلندیوں پر چھائی ہوئی ہے اور ان لوگوں کے لئے تیار کی جاتی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم (۵۷/۲۱) حقیقی فضیلت تو یہ ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق ملتی ہے اور اللہ بہت بڑی فضیلتیں عطا کرنے والا ہے۔

غور کیا سلیم! تم نے کہ قرآن نے کس طرح جذباتِ مسابقت کا رخ ایک بلند و بالا سمت کی طرف پھیر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم ایک دوسرے پر مسابقت عزت کے حصول کے لئے چاہتے ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے کہ عزت مال اور دیگر اضافیات کی کثرت کا نام ہے۔ حقیقی عزت یہ ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ تم میں سے جو شخص سب سے زیادہ اپنی معاشی زندگی کو سماوی قانون سے ہم آہنگ کر کے رکھے گا وہی سب سے زیادہ قابلِ عزت ہوگا۔ آؤ! اور اس میدانِ عزت و تکریم میں ایک دوسرے سے بڑھو۔ اس میدان میں بڑھنے سے وہ نظام قائم ہو جائے گا جس کا عملی نتیجہ جنتِ ارضی کا قیام ہوگا۔

سورۂ فاطر میں دیکھو جہاں وارثین کتاب خداوندی کے تین طبقات کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو ظالم لنفسہ (اپنے آپ پر زیادتی کرنے والے ہیں) دوسرے وہ جو مقتصد (بین بین چلنے والے ہیں) اور تیسرے وہ جو سابق بالخیرات (خوشگوار حالات پیدا کرنے میں آگے بڑھنے والے) ہیں۔ (۳۵/۳۲) یہ وہ سابقت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ ذالك هو الفضل الكبير۔ یہ وہ برتری ہے جس میں کبریائی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی وہ السابقون ہیں جن کے متعلق سورۂ واقعہ میں فرمایا کہ اولئك المقربون فی جنت النعیم۔ (۵۶/۱۰-۱۲)

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ انسان' ذخائر و انبار بالآخر چاہتا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کی عقل کا تقاضا تحفظ ذات (Preservation of Self)... ہے۔ ہر فرد کی عقل اس کی اپنی ہوتی ہے اس لئے ہر فرد' اپنی عقل کی روسے' اپنی ذات کا تحفظ چاہتا ہے۔ اگر غور کرو تو تکاثر و تفاخر بھی سب اسی تحفظ ذات ہی کی شق میں آجاتے ہیں۔ عقل کا یہ تقاضا کوئی مذموم تقاضا نہیں۔ یہ اس کا فریضہ ہے۔ وہ بنی ہی اس لئے ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کی حفاظت کرے۔ لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' چونکہ ہر فرد کی عقل الگ الگ ہوتی ہے اس لئے عقل صرف اپنے فرد کی حفاظت ہی کی فکر کر سکتی ہے۔ وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتی۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کی تمام کوششوں کے باوجود' انسان کا طبعی جسم فنا آمادہ ہو رہا ہے تو وہ اسے یہ کہہ کر تسلی دیدیتی ہے کہ اب تیری بقا تیری اولاد کے ذریعے ہو گی۔ وہ بیٹے کو باپ کا عکس بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ تیرے گھر کا چراغ اور تیرا نام روشن کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے تیرا ذکر آگے بڑھے گا اور تیرا سلسلہ آگے چلے گا۔ تم نے معارف القرآن جلد دوم میں پڑھا ہو گا کہ "ابلیس" نے آدم کو جس "ملك لا يبلى" (ایسی مملکت جو بہلو نہ بدلے) کی طرف دعوت دی تھی وہ اولاد کے ذریعے حصولِ بقا ہی کا تصور تھا۔ لیکن اس سے نہ تحفظ ذات ہوتا ہے نہ حیاتِ جاوید ملتی ہے۔ قرآن اسی عقل کو ایک بلند سطح پر لے جاتا ہے اور اس کے سامنے ایک ایسی حقیقت لے آتا ہے جس سے فی الواقعہ حیاتِ جاوید نصیب ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ افراد الگ الگ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ حیات ایک غیر منقسم وحدت ہے جس کی روسے تمام انسانیت ایک فردِ واحد کی طرح ہے۔ اصل تحفظ انسانیت کا ہونا چاہیئے۔ درخت کی سلامتی میں اس کی شاخوں اور پتوں کی سلامتی ہے۔ جسم کی صحت میں جسم کے جراثیم (Cells) کی صحت کا راز مضمر ہے۔ اس لئے وہ اسی عقل کو یہ سمجھاتا ہے کہ وہ فرد کے تحفظ کے لئے انسانیت کے تحفظ کی فکر کرے۔ اور انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک متوازن نظام زندگی قائم ہو جائے جس میں کم اکتسابی صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی کمیوں کو زیادہ استعداد رکھنے والوں کے نتائج سعی و عمل سے پورا کر دیا جائے۔ ان کمیوں کے پورا کر دینے سے نظام اجتماعیہ میں حسن (توازن) پیدا ہو جائے گا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس نظام سے وابستہ ہر فرد اپنی جان و مال کو اس نظام کے سپرد کر دے (ان الله اشترى من المومنين انفسهم واموالهم) اور وہ نظام ان تمام

افراد کی ضروریاتِ زندگی اور سامانِ نشوونما کا کفیل ہو جائے۔ (بأن لهم الجنة)۔
سلیم الانسان کے بے صبرا (ھلوعا) ہونے کی کیفیت کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینے کا جذبہ اپنے خاندان میں ماند پڑ جاتا ہے۔ یعنی ایک خاندان کا سرپرست، اپنے اموال و مقبوضات کو اپنی ذات تک مخصوص نہیں رکھتا بلکہ افرادِ خاندان کو بھی ان میں شریک کر لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن افراد سے انسان اپنا تعلق سمجھے انھیں وہ اپنے مال میں شریک کر لیتا ہے اور اس باب میں اس کا جذبۂ ہلوعیت یا حبّ الخیر مانع نہیں ہوتا۔ قرآن انسان کی نگاہوں میں کشادگی پیدا کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ حقیقی رشتہ سلسلۂ تولید سے منسلک نہیں بلکہ انسانیت کا رشتہ اصلی اور حقیقی رشتہ ہے۔ یعنی وہ رشتہ داری کی حدود کو عالمگیر بنا دیتا ہے اور خون کے رشتہ کو انسانیت کے رشتہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جذبات وہی ہیں۔ بس ان کی تسکین کیلئے میدان دوسرا دیدیا جاتا ہے۔ ترغیب و تحریص کی آیات میں یہ مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی ایک شخص اس لئے مال جمع کرتا ہے کہ اس کی اولاد کس مپرسی کی حالت میں نہ رہ جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تیری نگاہ کی بھول ہے جو فقط اپنی اولاد ہی کو اولاد سمجھ لیتا ہے، وہ یتیم بچہ جو کس مپرسی کی حالت میں رہ گیا ہے، فردِ نوعِ انسان ہونے کی وجہ سے تمہاری ہی اولاد ہے اس لئے تمہاری کمائی میں اس کا بھی حصہ ہے۔ ان آیاتِ ترغیب و تحریص کے متعلق عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ انفرادی صدقات و خیرات کی طرف مائل کرنے کے لئے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اسلامی نظام میں تمام ضرورتمندوں کی ضروریات کی کفالت خود نظام کے ذمہ ہوتی ہے۔ جب وہ صدقات و خیرات کی تلقین کرتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مختلف افراد، اپنی فاضلہ کمائی بطیب خاطر نظام کے سپرد کر دیں تاکہ وہ اس سے ان تمام ضروریات کو پورا کرتا رہے۔ بالفاظِ دیگر یہ ترغیبات و تحریصات درحقیقت اس معاہدہ کی استواری کی غرض سے ہوتی ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ قرآن ان لوگوں سے جنھیں زیادہ استعداد ملی ہوتی ہے یہ کہتا ہے کہ تم اپنی محنت کے معاوضہ ہی کے حقدار ہو۔ استعداد کی زیادتی تمہارے علم و ہنر کی پیداوار نہیں۔ یہ تو تمہیں وہبی طور پر بطور بخشش ملی ہے۔ لہٰذا استعداد کی زیادتی کی وجہ سے جتنا کچھ تمہیں ملتا ہے اس پر تمہارا کوئی حق نہیں بلکہ ان کا حق ہے جنھیں کم استعداد ملی ہے یا جن کی استعداد کسی ہنگامی حادثہ کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔

یہ ہے وہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت جس سے قرآن اپنا نظام معاشی قائم کرتا ہے۔ اس لئے جہاں اس نے کہا ہے کہ انّ الانسان خلق ھلوعاً (انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے) اس سے آگے وہ کہتا ہے کہ الا المصلین الذین ھم علیٰ صلوٰتھم دائمون۔ والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (۷۰/۲۲-۲۵) یعنی انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے لیکن جو لوگ صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں ان پر "بے صبراپن" کا یہ جذبہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یعنی اس جذبہ کی تسکین نظام صلوٰۃ میں ہوتی ہے جو حقیقی مساوات سکھاتا ہے اور افراد کو انسانیت کا جزو بنا کر دکھاتا ہے۔ اس نظام صلوٰۃ کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

اس کے قائم کرنے والے اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی کمائی میں ضرورتمند اور محروم الوسائل افرادِ انسانیت کا مشہود و معلوم حق ہے۔

پھر یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نظام کو ان افراد پر مسلط نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے جوہرِ انسانیت کی بالیدگی (تزکیۂ نفس) کا فطری نتیجہ اس نظام کا قیام ہوتا ہے۔

دیکھا سلیم! تم نے کہ قرآن، انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے؟ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد کس اصول پر قائم ہے اور اس نظام میں ذاتی ملکیت کا کہیں سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو مذہب کی دنیا ہے جو یہ آواز بلند کرتی رہتی ہے کہ مال ہر ایک کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ غریب و نادار کہیں یہ مطالبہ نہ کر بیٹھیں کہ انبار و ذخائر کے اِن مالکوں سے فاضلہ مال لے کر ہماری بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کی جائیں۔ لیکن رسولوں کی طرف سے لایا ہوا نظام، مذہب کا عنکبوتی جال نہیں ہوتا۔ دین کا نظام ہوتا ہے جو اس معاہدہ کی رو سے جس کا ذکر اوپر ہوتا چلا آرہا ہے، افراد کے اموال میں صرف تصرف ہی نہیں جائز قرار دیتا بلکہ ہر ایک کے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کی ملک قرار دیتا ہے تاکہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ میں توازن قائم رہ سکے۔ تم نے سلیم! معارف القرآن کی تیسری جلد میں حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ میں پڑھا ہوگا کہ آپ کی اسی دعوتِ انقلابِ معاشی کو دیکھ کر مفاد عاجلہ کے علمبردار پکار اٹھے تھے کہ یٰشعیب اصلوٰتک تأمرک ۔ ۔ ۔ ۔ ان نفعل فی اموالنا ما نشٰؤ (۱۱؍۸۷) اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا حکم دے رہی ہے کہ ہم اپنے اموال کو جس طرح ہمارا جی چاہے صرف میں نہ لائیں؟ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب کا معاملہ پوجا پاٹ کا معاملہ ہے اسے بھلا ہماری جاگیرداریوں اور زمینداریوں سے کیا تعلق؟ ہم اپنے مال کے خود مالک ہیں۔ جس طرح جی چاہے اسے خرچ کریں۔ یہ "مذہب کا نیا نظام" (یعنی دین کا نظام) ہے جو یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ افراد کو سامنے رکھنے کے بجائے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کو سامنے رکھو جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کے قانون و ضوابط کے مطابق صرف کرو کیونکہ یہ مال تمہاری ملکیت نہیں۔ تمہارے پاس بطور امانت رکھا ہے۔ سلیم! انسانی طبائع کی اس بوالعجبی پر غور کرو۔ جس طرح حضرت شعیبؑ کے زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ دین میں ذاتی ملوکیت کیوں جائز نہیں ہو سکتی اور اس قسم کی آواز بلند کرنے والے کو وہ گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتے تھے، آج بھی جو شخص یہ کہے کہ قرآنی نظامِ اجتماعیہ میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، قومِ شعیبؑ کی اسی پرانی آواز کی صدائے بازگشت ہر گوشے سے اٹھتی چلی آتی ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم - جواں ہیں لات و منات

یہ اس لئے کہ ہمارا آج کا اسلام ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار اور نظامِ سرمایہ داری کی یادگار ہے۔ کیا تم نے سلیم! قرآن میں

نہیں دیکھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہمیشہ مترفین کی طرف سے ہوتی تھی؟ یہ گروہ، دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والوں کا گروہ ہوتا ہے جسے آج کی اصطلاح میں (Vested Interests) والوں کی جماعت کہا جاتا ہے۔ وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون (۳۴/۳۴) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے سرمایہ دار گروہ نے ہمیشہ یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم تمہاری دعوت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ وقالوا نحن اکثر اموالاً و اولادا وما نحن بمعذبین (۳۵/۳۴) وہ یہ کہتے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی اکثریت ہے اور اس وجہ سے ہمارا اقتدار اتنا بڑا ہے کہ ہمیں کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ ہم دیکھیں گے کہ کون ہمارا بال بھی بیکا کرلے گا؟ قرآن میں سلیم! نویں پارہ کی ابتداء قال الملاء سے ہوتی ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ ٹکڑا ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کے ضمن میں آتا ہے۔ یعنی ان کی دعوت کی مخالفت ہمیشہ سردارانِ قوم کی طرف سے ہوتی تھی۔ اب ظاہر ہے سلیم! کہ اگر خدائی دعوتِ انقلاب سرمایہ دارانہ نظام کی مؤید ہوتی تو ان سرمایہ داروں کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں ہوا کرتی! ان مترفین کی مخالفت کے علی الرغم، رسول اپنا انقلابی نظام قائم کرجاتا لیکن اس کے بعد مترفین پھر قوت پکڑ کر اسے الٹ دیتے۔ (دیکھو ۱۴/۳۷) یہی سابقہ انبیاء کرام کے قائم کردہ نظام کے ساتھ ہوا اور یہی نبی اکرمؐ کے متمکن فرمودہ دین (نظامِ خداوندی) کے ساتھ۔ کچھ وقت کے لئے یہ نظام قائم رہا اور پھر مترفین نے اسے ملوکیت اور سرمایہ داری میں بدل دیا۔ ہمارا موجودہ مذہب، دین کی اسی تبدیل شدہ صورت کا نام ہے۔

سلیم! اب یہ حقیقت تمہارے سامنے آچکی ہوگی کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے! اور شاید یہ بھی تم سمجھ گئے ہوگے کہ کسی معاشی نظام کو اس فلسفۂ زندگی سے کیوں الگ نہیں کیا جاسکتا جس پر وہ نظام متفرع ہوتا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! ایک شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی بس یہی زندگی ہے موت کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ اور یہ کہ ہر فرد اپنی طبیعی زندگی الگ الگ رکھتا ہے۔ اس عقیدہ کے بعد تم سلیم! اس سے کہتے ہو کہ تم محنت اور مشقت سے جو کچھ کماؤ اس میں سے صرف اتنا اپنے پاس رکھو، باقی دوسروں کو دیدو۔ سلیم! ذرا غور کرکے بتاؤ کہ وہ کس دلیل یا کونسے جذبۂ محرکہ کے ماتحت ایسا کرنے پر راضی ہوجائے گا؟ زیادہ سے زیادہ تم اس کے جذبۂ ہمدردی کو ابھارنے کی کوشش کروگے۔ لیکن اس طرح کے جذبۂ ہمدردی کا نفسیاتی تجزیہ کرو تو وہ اعصابی کمزوری پر مبنی ہوتا ہے۔ کمزور اعصاب والا انسان دوسروں کی داستانِ مصائب سے متاثر ہوجائے گا اور بھیک کا ٹکڑا ان کی طرف پھینک دے گا۔ یا اس سے آگے بڑھو تو تم اس سے کہوگے کہ دیکھو بھائی! آج تم بہت خوشحال ہو لیکن ہوسکتا ہے کہ کل ہی تم کسی حادثہ کے شکار ہوجاؤ اور تمہاری بھی یہی حالت ہوجائے جو اس بیکس و نادار کی ہے۔ اس لئے اگر تم

سلیم! اس آیتِ جلیلہ میں علاوہ اور نکاتِ مہمہ کے، رَدّ کے لفظ پر غور کرو۔ اس کے معنی ہیں واپس کر دینا۔ یعنی جس کی چیز ہے اسے واپس دیدینا۔ غور کیجئے! معاشی توازن کے قیام کے لئے اس گہرائی تک پہنچنا قرآن کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟ یہ ہے وہ اصولی فلسفۂ زندگی جس پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، معاشی نظام، قرآن کے ہمہ گیر نظامِ حیات کی ایک شاخ ہے، اس سے الگ نظام نہیں۔ فلہذا جب تک قرآن کا نظامِ حیات نہ سمجھ لیا جائے اس کے معاشی نظام کی کنہ و ماہیت اور اصل و غایت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اگر انسان یہ سمجھ لے (جیسا کہ مادی نظریۂ حیات نے اسے سمجھا رکھا ہے) کہ زندگی مادی اجزاء کی ترتیب کا نام ہے اور جب ان اجزاء میں انتشار واقع ہوجاتا ہے تو زندگی ختم ہوجاتی ہے، تو اس کے سامنے زندگی کا سارا مسئلہ ہی معاشی رہ جاتا ہے۔ اس سے آگے اس کا تصوّر جا ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ سلیم! محض معاشی مسئلہ حیوانیت کی سطح (Animal Level) کا مسئلہ ہے یعنی سلسلہ ارتقاء میں جو کڑیاں پیچھے رہ گئی ہیں اور انہیں جس سطح پر پیدا ہوتا ہے اسی سطح پر مر جاتا ہے۔ ان کا مسئلہ زیست فقط معاشی ہے۔ مثلاً ایک گائے جس قدر کوئی استعداد لیکر پیدا ہوتی ہے مرتے وقت تک اس استعداد میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کی زندگی کا سوال فقط زندہ رہنا ہے جس کا حل معاش میں مل جاتا ہے۔ یعنی اگر اسے کھانے پینے کو ملتا جائے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے انسان کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی اور فلہذا اپنی ذات میں مکمل سمجھ لیا ہے۔ وہ اس کی مزید ارتقائی منازل کا قائل ہی نہیں۔ اس لئے اس کے نزدیک اس کی زندگی کا مسئلہ بھی محض معاشی ہے جس طرح اور حیوانات کا مسئلہ معاشی ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ایک فرد کی دنیاوی زندگی ہی کو دیکھے تو وہ جس ذہنی سطح پر بچپن میں ہوتا ہے عمر کے اگلے حصہ میں وہ سطح کہیں بلند ہوچکی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سلسلۂ ارتقاء اسی زندگی تک نہیں رہتا بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان اپنی ذات میں مکمل نہیں ہوچکا۔ اسے ابھی کچھ اور بننا ہے۔ وہ (Being) نہیں بلکہ ہنوز (Becoming) ہے۔ اس کا مسئلہ فقط معاشی مسئلہ نہیں، معاشی مسئلہ تو اس کی طبیعی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن اس مسئلہ کو بھی خاص اہمیت دیتا ہے، کیونکہ طبیعی زندگی مقصود بالذات نہیں لیکن ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تو ہے۔ اس لئے حصولِ مقصد کے لئے ذریعہ کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر ذریعہ ہی مقصد بن کر رہ جائے تو انسان، حیوانیت کی سطح پر چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو ماہیت کی اس حیوانی سطح سے بہت اوپر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقطار السموٰت والارض (زمین و آسمان یعنی طبیعیاتی کائنات) [illegible] بشرطیکہ تمہیں سلطان (غلبہ و تسلط) حاصل ہوجائے۔ (۵۵/۳۳)۔

مادیت پر یہ غلبہ اپنے آپ کو مادہ کے محبس آب و گل سے اوپر لے جانے سے حاصل ہوسکتا [illegible]

زندگی کو سماوی اقدار مستقلہ کے تابع رکھنے اور اس طرح اپنی اجتماعی زندگی کو کائناتی قانون سے ہم آہنگ کرنے سے۔ اس طرح انسان اپنے رب ذی المعارج (نشوونما کے ذریعے بلندیوں کی طرف لے جانے والے خدا) کے ہمرنگ ہو کر طبقاً عن طبقاً (منزل بہ منزل) بلند ہوتا چلا جائے گا۔ (لترکبن طبقاً عن طبق)۔ کیونکہ اس کا منتہیٰ اس کے رب کی طرف ہے۔ (والی ربك منتهها)۔

کیا سلیم! اب بھی بات سمجھ میں آئی یا نہیں؟ اچھا۔ خدا حافظ۔ والسلام

پرویز

اقبال نمبر

طلوع اسلام محض رسمی علامہ اقبال کی یاد میں شائع نہیں ہو رہا بلکہ انہی کے پیغام حیات آور کی نشر و اشاعت کے لئے وقف ہے۔ اقبال کا پیغام درحقیقت قرآن کا پیغام ہے۔ اس اعتبار سے طلوع اسلام کا ہر نمبر اقبال نمبر ہوتا ہے لیکن چونکہ اپریل کا مہینہ علامہ مرحوم کی وفات کا مہینہ ہے اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مہینہ کی اشاعت کو انہی کی یاد سے مختص کر دیا جائے۔

چنانچہ طلوع اسلام کا اگلا پرچہ اقبال نمبر ہوگا جو حقیقی اقبال سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہوگا۔ اس مجموعہ میں محترم پرویز صاحب کا مضمون اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام بھی شامل ہوگا جو موصوف کی اقبال فہمی اور بصیرت قرآنی کا نادر نمونہ ہوگا۔

اقبال نمبر کی ضخامت عام پرچہ کی ضخامت سے غالباً بڑھ جائیگی لیکن اس کی قیمت صرف آٹھ آنے ہوگی۔

ایجنٹ حضرات زائد پرچوں کے لئے اپنی فرمائشیں مارچ کے تیسرے ہفتہ تک ضرور بھیج دیں ورنہ ادارہ تعمیل سے قاصر ہوگا۔

جو مشتہرین حضرات اقبال نمبر کی غیر معمولی مقبولیت سے فائدہ اٹھانا چاہیں وہ اپنے اشتہارات ۲۰ مارچ تک ارسال فرما دیں۔

طلوع اسلام کا چندہ سالانہ چھ روپے فی پرچہ آٹھ آنے

میں کمیونسٹ ہوں؟

(ایک غریب اور بدصورت کے قلم سے)

کچھ عرصہ ہوا لاہور کے ایک اخبار میں اس کے مدیر محترم کا ایک مقالہ بعنوان "معیاری دستور اساسی میں غریبوں اور بدصورتوں کا درجہ" شائع ہوا۔ چونکہ اتفاق سے میں امارت اور حسن دونوں نعمتوں سے محروم ہوں، اس لئے میں نے اس مقالہ کا مطالعہ خاص دلچسپی سے کیا۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنا تمام زورِ بیان اور زورِ استدلال یہ ثابت کرنے پر صرف کر دیا کہ غریب اور بدصورت اپنی موجودہ خستہ حالی اور پریشاں روزگاری کے ذمہ دار خود ہیں۔ اس کی دلیل یہ بتائی گئی کہ قدرت نے ذہنی و جسمانی صلاحیتیں سب انسانوں کو یکساں طور پر عطا کی ہیں۔ جن لوگوں نے ان صلاحیتوں سے پوری طرح کام لیا انھیں امارت اور حسن کی دولتوں سے نوازا گیا۔ اور جن لوگوں نے اپنی قویٰ کو معطل رکھا وہ غریب اور بدصورت رہ گئے۔

یہ ایک غلط استدلال تھا۔ میں نے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر فاضل مدیر سے اختلاف کیا اور انھیں لکھا کہ غریب اس لئے غریب نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتا بلکہ اس کے افلاس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کی محنت کے نتائج کی ترتیب میں سرمایہ دارانہ نظام کا تعطل حائل ہوتا ہے۔ میں نے انھیں اپنے گرد و پیش سے چند ایک مثالیں دیکر بتایا کہ غریب پوری طرح سرگرمِ عمل رہتا ہے اور امیر عام طور پر کاہل ہوتا ہے۔ لیکن امارت اور حُسن کی فراوانی امیر کے لئے مخصوص رہتی ہے۔ لیکن مدیر موصوف کو اصرار تھا کہ غریب اپنی بدبختی کا ذمہ دار خود ہے کیونکہ وہ "غلاظت میں رینگنے والا کیڑا" ہے اور اس سطح سے بلند ہونے کے لئے وہ جدوجہد نہیں کرتا۔ مدیر موصوف کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ جب دنیا میں غریبوں کی اکثریت ہے اور امیر انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں تو غریب اپنی عملی قوتوں کو بروئے کار لاکر امیروں کا تسلط کیوں ختم نہیں کر دیتے۔

اس نظریئے نے مجھے اپنی ستائش (یا اظہارِ حقیقت) پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر طلوعِ اسلام کے صفحات میری اس ذاتی داستان کے متحمل ہو سکیں (جو دراصل روداد جہاں ہے) تو اس سے میری طبیعت کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے گا۔

جنگِ پاکستان میں میری طبیعت کی جنونی افتاد نے مجھے میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء تک مجھے پاکستان کے ساتھ صرف نظری دلچسپی رہی۔ لیگ کے اجلاسِ لاہور کے موقع پر میں پہلی بار لیگ کا دو آنے کا رکن بنا اور ۳ر جون سنہ ۱۹۴۷ء تک میں نے اپنی تمام قوتوں کو حصولِ پاکستان کی جدوجہد کیلئے وقف کر دیا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں ایک غریب آدمی ہوں۔ سیاسیات کے خارزار میں قدم

رکھنے کے ساتھ مسئلہ معاش زیادہ شدید صورت میں سامنے آگیا۔ لیگ کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں مجھے وقت اور صحت کے ساتھ جیب کی قربانی بھی کرنی پڑی۔ اپنی روٹی کے علاوہ مجھے اس قدر اہتمام کرنا تھا کہ لیگ کے سلسلہ میں دوروں، آمدورفت کے کرائے، جلسوں، جلوسوں، کاغذات اور ڈاک وغیرہ کا خرچ خود برداشت کر سکوں، کیونکہ ہماری ابتدائی لیگ کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا۔

اس مقصد کے لئے مجھے اپنے ایک مقامی سکول میں شغلِ تدریس اختیار کرنا پڑا۔ اس شغل نے میری ملی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کیا۔ لیگ کی سرگرمیاں تیز تر ہو رہی تھیں۔ اب میرے سامنے ان نونہالوں کی تربیت کا سوال بھی تھا جو سکول میں میرے سپرد ہوئے عام طور پر سکولوں اور خداوندانِ مکتب کی جو حالت ہے اس کے پیشِ نظر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجھ ایسے حساس آدمی کے لئے طلبہ کی ذہنی و اخلاقی حالت، کس قدر پریشان کن ہو سکتی تھی۔ میرے سامنے ان کا تعلیمی مستقبل ہی نہ تھا بلکہ میں انھیں پاکستان کے قابلِ فخر سپاہی اور شہری دیکھنا چاہتا تھا۔ اس فریضہ نے میرے وقت اور قویٰ کا ہی نہیں جیب کا بھی مزید امتحان لیا۔ ظلم یہ تھا کہ میں تربیت کے کاغذی پروانہ سے محروم تھا۔ محکمہ تعلیم کو میری کارگذاری سے دلچسپی نہ تھی بلکہ اسے واسطہ صرف اس چیز سے تھا کہ میں باضابطہ تربیت یافتہ مدرس نہیں ہوں۔ اس لئے میں زیادہ تنخواہ کا حقدار نہیں ہو سکتا نہ ترقی کا امیدوار ہو سکتا ہوں۔ میں نے اپنی ناداری کے باوجود بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن مڈل یا میٹرک پاس کاغذی سند یافتہ استاد کے مقابلہ میں میری تنخواہ کم تھی۔ مجھے ان تمام ناگوار فرائض کے معاوضہ میں (جو پاکستان کے ایک مظلوم مدرس کو سرانجام دینے پڑتے ہیں) کل چالیس روپے ماہانہ ملتا تھا۔

میں اس معاوضہ کو اس لئے بخوشی قبول کر رہا تھا کہ اس کے سوا میرے لئے کوئی اور راہ نہ تھی۔ ان چالیس روپوں میں سے میں ذاتی خرچ پورا کرتا تھا، لیگ کی سرگرمیوں پر خرچ کرتا تھا، انہی سے بعض نادار طلبہ کی امداد کرتا تھا۔ بعض اوقات اپنی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے باہر کے مقامات میں جانا ہوتا تھا۔ اس کا تمام بوجھ ذاتی جیب پر پڑتا تھا۔ اپنے شہر میں کبھی کوئی لیڈر آجاتا تو اس کی شاہانہ روٹی کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ اس کا سامان اپنے کندھے پر اٹھاتا تھا تاکہ قلی کے پیسے نہ دینے پڑیں۔ جلسہ کیلئے سٹیج کی تیاری، لاؤڈ سپیکر کا کرایہ اور دیگر متعلقہ اخراجات پورا کرنے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہم تین چار رفقائے کار یہ تمام اخراجات اپنے اوپر مساوی تقسیم کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص چندہ دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

یہ سلسلہ جنوری ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا۔ اس دوران میں ۱۹۴۶ء کے انتخاباتِ عمومی اور اس کے بعد ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کے سلسلہ میں جو کچھ بیتی اس کا اندازہ خود ہی کر لیجئے۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں اس وقت کی خضر وزارت کے خلاف تاریخی سول نافرمانی شروع ہوئی۔ طبیعت کے جنون نے مجھے اس میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے چالیس روپے کی ماہانہ آمدنی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ مجھے ملازمت سے برطرف

کر دیا گیا۔ میری تشکیل کردہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ میرے طالب علم کارکنوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ مجھے متفرق قسم کے قانونی شکنجوں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ سول نافرمانی کے دوران میں بعض غیر ذمہ دار عناصر نے ہماری جماعت کے علم اور اجازت کے بغیر ریل گاڑیوں کو روک کر مسافروں کو زدوکوب کیا اور کچھ شکست و ریخت بھی کی۔ ہیڈ ماسٹر نے اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے ملازمت سے علیحدگی کو ہی کافی نہ سمجھا بلکہ پولیس کے ایک سکھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی کہ اس تمام زدوکوب اور شکست و ریخت کا ذمہ دار میں ہوں۔

ہیڈ ماسٹر کی اس حرکت کے خلاف شہر میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس نے شہر کے امیروں کی پناہ لی۔ یہ امیر اب تک اخلاقاً اور عملاً میرے ساتھ تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر کے مقابلے میں وہ میرا ساتھ نہ دے سکے۔ اس لئے کہ میں دونوں کا ہم پلہ نہ تھا۔ ان امیروں نے میری تمام خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر کا ساتھ دیا۔ اسے بے گناہ ثابت کرنے کیلئے رسولؐ کے نام کو استعمال کیا گیا۔ سیرت النبیؐ کے نام پر ایک جلسہ کیا گیا جس کی صدارت اسی ہیڈ ماسٹر کے سپرد کی گئی، اسے ایک جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ تک لایا گیا۔ اس کے "زندہ باد" کے نعرے لگوائے گئے۔ جلسہ میں ہیڈ ماسٹر کو بے گناہ ثابت کیا گیا اور میری مذمت کی گئی ۔۔۔ اور یہ سب کچھ نبیؐ کے مقدس نام پر کیا گیا۔ فقیہانِ شہر میرے خلاف متحد ہو چکے تھے۔

اب میرے لئے اس فضا میں کام کرنا مشکل تھا۔ جنونِ خدمت بیکار رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی خدمات صوبہ لیگ کو پیش کر دیں۔ میں لاہور مرکزی لیگ کے دفتر میں چلا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ لیگ کے تمام چھوٹے بڑے کارکن جیلوں میں بند تھے اور صوبہ لیگ کے دفتر میں کوئی قابلِ ذکر کارکن موجود نہ تھا۔ میرے سپرد نشر و اشاعت کا کام کیا گیا۔ اس کے علاوہ مجھے باہر بھی بھیجا جاتا رہا۔ اس دوران میں فیروزپور کا دورہ میرے لئے خاصا پریشان کن رہا۔ میں بڑے پراسرار انداز میں وہاں سے گرفتاری اور وہاں کے ایک فرعون مزاج انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بید زنی سے بچ کر بھاگا۔

سول نافرمانی کی تحریک جب ختم ہوئی میں لاہور میں ہی تھا۔ میں ۲۸ فروری تک بڑے ذوق و شوق سے کام کرتا رہا لیکن لیڈروں کی آمد کے ساتھ ہی میرا ولولۂ عمل کچھ سرد پڑ گیا۔ میں نے اپنے اور اپنے لیڈروں کے درمیان اس قدر خلیج محسوس کی کہ میرے لئے چند لمحے گزارنا بھی مشکل ہو گیا۔ مجھے دفتر میں مزید کام کرنے کا حکم دیا گیا لیکن میں اگلے روز وہاں سے واپس آ گیا۔

اس کے بعد فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اپنے شہر میں واپسی پر میرے لئے ایک مسئلہ یہ تھا کہ میرا ذریعہ معاش ختم ہو چکا تھا۔ جذبۂ خدمت تیز تر ہو رہا تھا۔ فسادات کے بعد ہمارے علاقے کے مسلمانوں پر ابتلا کا ایک صبر آزما دور آیا۔ اس صورت میں اب میرا قیام اور زیادہ ضروری ہو گیا۔ انتہائی نکبت و افلاس میں چند ماہ گزارے۔ لوگ تشدد اور سخت گیری سے بے حال ہو رہے تھے اور وہ بار بار اپنی لیگ کے پاس دوڑتے تھے۔ لیگ کے مقامی دفتر میں میرے سوا صرف ایک

کارکن اور تھا۔ اس کے سوا نہ کوئی متاع تھی نہ سرمایہ۔ تاہم اس بے بضاعتی اور بے کسی کے باوجود میں نے دفتر کا خرچ بھی چلایا اور فوج کی سنگینوں اور بندوقوں سے بچا بچا کر دیہات سے دہشت زدہ عوام کے پاس بھی پہنچاتا رہا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم کی تجویز کا اعلان ہوا تو مجھے فرار کی ایک صورت نظر آئی۔ معاشی مسئلہ نے بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ لیگ کا خرچ کافی بڑھ چکا تھا۔ اس عرصے میں ایک نیک دل افسر اعلیٰ نے . . . . دو صد روپے کی رقم عنایت کی۔ ۳ جون کو اس میں سے صرف سوا آٹھ روپے باقی تھے۔ میں اس اطمینان کے ساتھ اپنی قوم سے رخصت ہوا کہ میں نے پاکستان کی جنگ میں قوم کا پورا ساتھ دیا ہے۔ دو ماہ کے بعد پاکستان قائم ہوگیا۔ میری امیدوں کی دنیا آباد ہوگئی۔ میری کوششیں کامیاب ہوئیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میری زندگی کا خوشگوار ترین دن تھا۔

اس کے بعد میرے ساتھ کیا بیتی؟ یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں اس کی تفاصیل نہیں دینا چاہتا۔ ان تفاصیل کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے شہر میں پاکستان کی جائیداد (جو غیر مسلم چھوڑ گئے تھے) الاٹ کرنے کا کام جس شخص کے سپرد ہوا وہ وہی ہیڈ ماسٹر تھا جس نے چند ماہ پیشتر ہی مجھے پاکستان اور مسلم لیگ کے ساتھ وابستگی کے جرم میں ملازمت سے نکال دیا تھا اور جو مجھے عمر بھر کی قید دلوانے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔

پاکستان میں مجھے کیا ملا یا کیوں کچھ نہیں ملا؟ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے پاکستان اپنے لئے طلب نہیں کیا تھا کہ مجھے اس سے کسی ذاتی منفعت کی توقع ہوتی۔ لیکن جو لوگ آخر دم تک پاکستان کے بدترین مخالف رہے اور جن کے ہاتھوں پاکستان کے جانباز خادموں کو گوناگوں مصائب جھیلنے پڑے ان کو پاکستان میں سب کچھ مل گیا۔ یہ امر مجھے اکثر مضطرب رکھتا ہے۔ جوں جوں وقت گذر رہا ہے ان عناصر کی گرفت مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ گویا پاکستان کی قسمت کے مالک وہ اشخاص بن رہے ہیں جو غیر ملکی اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹ رہ کر پاکستان کے شدید دشمن رہے ہیں۔

قریباً ڈھائی سال ٹھوکریں کھانے کے بعد آج سے دو ماہ پیشتر میں ایک اردو روزنامہ میں ملازم ہوگیا۔ طبیعت کو کچھ اطمینان ہوا کہ اب فکرِ معاش سے آزاد ہو جاؤں گا۔ دو ماہ اخبار میں کام کیا۔ پہلے مہینے کی تنخواہ کا وقت آیا تو میٹھے میٹھے الفاظ سے ٹال دیا گیا۔ سارا مہینہ تقاضوں میں گزر گیا۔ اگلے مہینے تقاضے ذرا شدید ہوگئے۔ حالات کی مجبوری نے زبان کو بے قابو کر دیا۔ تقاضے کچھ تیز بھی ہونے لگے۔ اب صورت یہ ہے کہ اخبار کے مالکوں نے مجھے اور میرے چار ساتھیوں کو ملازمت سے نکال دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم نے کوئی بدمعاشی یا کام چوری کی ہے۔ مالکوں کا عذر یہ ہے کہ ہم کمیونسٹ ہیں اس لئے وہ ہم کو دفتر میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم کمیونسٹ کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ہم مالکوں سے تنخواہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ جب تک ہم خاموش رہے یا ہمارے تقاضے مدہم تھے ہم پر یہ شبہ نہیں تھا۔ اب ہم اپنی مزدوری مانگنے لگے ہیں تو ہم کمیونسٹ بن گئے ہیں۔ مالکوں کے مراسم

دوائرِ اعلیٰ کے ساتھ ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ ہمارا "کمیونزم" کسی وقت ہم کو جیل خانے پہنچا دے۔ آخر ہم یہ کیسے منوا سکتے ہیں کہ ہم کمیونسٹ نہیں ہیں۔

اخبار کے مالکوں کو "بڑے لوگ" "افسر" اور "صاحبِ ثروت" ہونے کی حیثیت سے جو سہولتیں حاصل ہیں اُن سے ہم کلی طور پر محروم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مظلومیت کی داستان کوئی سننے کو تیار نہیں ہوتا اور جو سننے کی تاب لاتا ہے اسے ہماری مظلومیت کا یقین نہیں آتا۔ ہم اس شہر کے ایک اور روزنامہ کے پاس گئے اور یہ درخواست کی کہ اپنے ہم پیشہ بھائیوں کے ساتھ اس صورت میں اظہارِ ہمدردی کریں کہ اپنے اخبار میں خبر ہی شائع کر دیں۔ لیکن اسلامی نظام کے اس داعی نے یہ عذر پیش کر کے خبر شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ اخبار سے نکالے جانے کے بعد ہم ان کے ہم پیشہ نہیں رہے۔ لہٰذا ہم ان کی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ دوسرا عذر انھوں نے یہ پیش کیا کہ جس اخبار نے ہمیں بے روزگار کیا ہے اس کے مالکوں کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم ہیں۔ اس لئے وہ اس کے مفاد کے خلاف جانے والی خبر نہیں چھاپ سکتے۔

پاکستان کی خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس کے پاس خبر لے کر گئے۔ اس نے یہ کہہ کر ہمیں دھتکار دیا کہ چونکہ اخبار ایجنسی کا گاہک ہے، اس لئے وہ اس کی بدنامی نہیں کر سکتے۔ یہ پاکستان کی "آزاد" خبر رساں ایجنسی ہے۔ لاہور کے ایک انگریزی روزنامہ کے مقامی نمائندے سے ملے۔ یہ روزنامہ غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ طبقوں کے درد میں اکثر بے حال رہتا ہے۔ اس کے نمائندے نے صاف جواب دیا کہ وہ ہمیں سراسر قصوروار سمجھتا ہے کہ ہم نے مالکانِ اخبار سے تنخواہ کا تقاضا کر کے انھیں مالی پریشانیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ ہماری مالی پریشانیوں کا بھی احساس کسی بندۂ خدا کو ہونا چاہیے یا نہیں؟ اس کا جواب نمائندہ موصوف نہ دے سکے۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر ہم کارکن صحافیوں کی یونین کے ہاں فریاد کناں ہوئے۔ یونین اس آئینی پیچیدگی میں الجھ گئی کہ ہم اس کے باضابطہ رکن نہیں ہیں، اس لئے ہماری دادرسی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے یونین کے سکرٹری کو داخلے کے فارم دیتے ہوئے بتایا کہ ہم نے ان فارموں پر کئی روز سے دستخط کر رکھے ہیں لیکن فیس داخلہ کے ڈھائی روپے کہاں سے لائیں۔ اگر تنخواہ مل جاتی تو ڈھائی روپے ادا کر کے یونین کے رکن بن جاتے۔ مگر یونین ہماری کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں۔

جو لوگ کل تک بڑی عقیدت سے ہمیں آ کر ملتے تھے وہ اب ہمارے سلام علیکم کے جواب کے بھی روادار نہیں۔ انھیں مالکانِ اخبار نے اپنی برتر پوزیشن اور اپنے برتر ذرائع سے یقین دلا دیا ہے کہ ہم کمیونسٹ ہیں۔ لہٰذا ہم سوسائٹی میں آزادانہ حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں رہے۔

ہم نے قانونِ وقت کی بھی پناہ لینے کی کوشش کی۔ ملک کی قانونی دستاویز میں قانونِ ملازمین کے نام سے ایک

قانون موجود ہے۔ لیکن ملک کا قانون بھی ہمیں پناہ دینے کو تیار نہیں۔ کیونکہ دفتر والوں نے اپنے ملازمین کا کوئی باضابطہ ریکارڈ نہیں رکھا۔ ان کی بے ضابطگی کی سزا ہمیں ملے گی اور ہم مولہ قانون سے امداد طلب نہیں کر سکیں گے۔

اب تک صرف ایک طبقہ کی طرف سے ہمیں کامل امداد کا یقین دلایا گیا ہے ۔ اور وہ ہے کمیونسٹوں مزدوروں اور طلبہ کا طبقہ۔ یہ شوریدہ سر پہلے ہی حکومت کے عتاب کا نشانہ ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے حق میں مظاہرے کریں اور اپنے ساتھ ہمیں بھی جیلوں میں بھجوا دیں۔ نظام وقت نہ تو انصاف کر سکتا ہے نہ انصاف طلبی کی چیخ و پکار کو سن سکتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم افلاس، بھوک، بے روزگاری اور رسوائی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ہماری روزی چھیننے والا احباؔ بدستور چل رہا ہے۔ کائنات کے کسی گوشے میں کوئی ستم واقع نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ ہم سی آئی ڈی کی "چشم کرم" میں آگئے ہیں اور اپنے دوست احباب نے ہم کو اچھوت سمجھنا شروع کر دیا ہے۔

یہ ہے کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی تیاری!

پاکستان زندہ باد!

آپ کے شہر میں
طلوع اسلام کی ایجنسی نہیں ہے تو آپ قائم کیجئے
شرائط ایجنسی ناظم ادارہ سے طلب کیجئے

اپنے مالِ تجارت کو
صحیح گاہکوں سے روشناس کرانے کے لئے
طلوع اسلام میں اشتہار دیجئے
نرخنامہ اشتہارات ناظم ادارہ سے طلب فرمائیے

"رسول کا مقام"

(خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی اے۔ امرتسری جہلم)

پیغام خدا نخست آدمؑ آورد — انجام بشارت ابن مریمؑ آورد

باجملہ رسل نامہ بے خاتم بود — احمدؐ بر نامہ وخاتم آورد

موقر روزنامہ زمیندار لاہور مورخہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ میں ایک مقالہ زیر عنوان "رسول کا مقام" حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی ڈھاکہ کے نام کے ساتھ شائع ہوا۔ بظاہر یہ جواب ایک مقالہ کا ہے جو ماہنامہ "طلوع اسلام" کراچی نمبر ۷ جلد ۲ میں زیر عنوان "اسباب زوال امت" شائع ہوا۔ یہ مقالہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن مولانا ممدوح نے بغرض حوالہ جو اقتباس دیا ہے وہ میری اپنی تحقیق کے مطابق ایک حد تک ہے۔ اس موضوع پر میرے مضامین جرائد اسلامیہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ میں اس موضوع پر مفصل بحث کر چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں، میں صرف مولانا ممدوح کے مقالہ پر تنقید کروں گا۔

مولانا ممدوح نے اپنے مقالہ میں رسول کریمؐ کا مقام محمود تو واضح نہیں فرمایا اور جو کچھ ارشاد فرمایا ہے آنحضرتؐ کے مقام کو اس سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ اگر مقام جمعیۃ العلماء ہند یا دیو بند عنوان ہوتا تو موزوں تھا، جن کی توجہ قرآن سے ہٹ کر "فقہ" کی طرف تمام تر لگی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا مقام اعلیٰ وہ ہے جہاں تک ہماری رسائی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مبارک میں واضح فرما دیا ہے۔ اگر ہمارے علماء قرآن میں تدبر کرتے تو ان پر بھی آنحضرتؐ کا مقام واضح ہو جاتا، مگر یہ حضرات اس مقام کی تلاش احادیث میں کرتے ہیں یا چند فقہی مسائل میں، جن میں شدید اختلاف ہے۔ احادیث کی نسبت تمام ائمہ دین متقدمین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "ظنی علم" ہے (ملاحظہ ہو موضوعات کبیر) اس ظنی بنیاد پر آنحضرتؐ کے مقام کی عمارت بلند کرنا اہل تحقیق سے بعید ہے۔ یہ بھی حقیقت ثابتہ ہے کہ احادیث باللفظ روایت نہیں ہوئیں، اس لئے محفوظ کلام بھی نہیں، حالانکہ قوانین شریعت کا ہر ایک لفظ محفوظ ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم کا ہر ایک لفظ محفوظ ہے۔ اس کا نام ہی حکیم ہے۔ اس کی ہر ایک سورت، ہر ایک آیت محکم ہے۔ متشابہات کتب مقدسہ سابقہ کی آیات ہیں جن کا حوالہ بغرض تصدیق قرآن میں دیا گیا ہے۔ یہ تاویل کی محتاج ہیں اور تاویل قرآن میں محکمات کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اس لئے ان کو بھی محکم کی حیثیت حاصل ہے، لیکن قرآن عظیم متشابہات سے

علیحدہ اور اعلیٰ و ارفع شے ہے۔ ارشاد قرآن ہے:

لقد اتینٰک سبعاً من المثانی والقراٰن العظیم۔

تحقیق ہم نے تجھے مثانی میں سے سات (آیاتِ احکام) اور قرآن عظیم عطا فرمایا۔

"عظیم فعیل کے وزن پر ہے اور دوام کا طالب ہے" المثانی "نام ہے اسفار موسیٰ کی پانچویں کتاب کا جس کا ترجمہ یونانی میں "ڈیوٹرونومی" ہے یعنی دہری یا دہرائی ہوئی آیات" یہ دس احکام موسوی ہیں۔ ان میں سے سات انجیل (مقدس متی ۱۹/۱۸) اور قرآن میں لئے گئے ہیں۔ یہ اصولی احکام ہیں اور ہر ایک شریعت کی بنیاد ہیں۔ یہ احکام قرآن میں سورۂ بنی اسرائیل اور دیگر آیات میں مذکور ہیں۔

احکام اصل میں دو ہیں صلوٰۃ اور زکوٰۃ اور انہی کے تحت تمام احکام مطلق ہوں یا وقتی آجاتے ہیں۔ مولانا ممدوح نے انہی کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ صلوٰۃ کی نسبت مولانا ممدوح کا بیان کا نہ ارشاد ہے کہ قرآن میں رکعات کا تعین نہیں کیا گیا۔ ارشاد قرآن ہے

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر واللہ یعلم ما تصنعون (۲۹/۴۵)

تحقیق صلوٰۃ بے حیائی اور نامعقول باتوں سے روکتی ہے اور یاد ہے بڑی اللہ کی اور اللہ جانتا ہے جو تم صنعت کے کام بنتے ہو۔

یہ تو صلوٰۃ کی تعریف ہے فحشا اور منکر میں تمام نواہی آجاتی ہیں۔ اگر قرآن حکیم میں باوجود اس امر کے کہ صلوٰۃ کا حکم سات سو سے زائد دفعہ آیا ہے بقول مولانا ممدوح رکعات کا تعین کرنا کچھ مشکل بات بھی نہ تھی تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رکعات اور ان کا تعین صنعت ہی ہوگا خواہ یہ پسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ اب مولانا ممدوح کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ تسلیم کریں کہ اگر ان کا مذکور صرف احادیث میں ہے اور ان کا تعین آنحضرتؐ نے فرمایا تو یہ آنحضرتؐ کی صنعت ہی ہوگی لیکن حقیقت یہ نہیں ہے ارشاد قرآن ہے کہ

جب تم سفر کر رہے ہو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ نماز کو تاہ کر دو اگر تم کو خوف ہو کہ وہ لوگ جو بالتحقیق تمہارے علانیہ دشمن ہیں تم کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے اور جب تو ان میں ہو تو ان کے لئے نماز قائم کر۔ پس چاہیئے کہ ان میں سے ایک جماعت تیرے ساتھ نماز میں کھڑی ہو اور مسلح ہو۔ پس جب یہ جماعت سجدہ سے فارغ ہو تو پیچھے ہٹ جائیں (اور محافظ جماعت کی جگہ لے لیں) اور دوسری جماعت جس نے نماز ادا نہیں کی تیرے ساتھ مسلح رہتے ہوئے نماز ادا کریں۔ (۴/۱۰۱-۱۰۲)

یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قیام کے بعد رکوع اور رکوع کے بعد سجدہ فطری علی الترتیب ہے۔ نا ممکن ہے کہ قیام کے بعد بلا رکوع سجدہ ہو۔ آیہ مبارکہ میں دو ہی رکعت ثابت ہوتی ہیں اور قصر میں ایک رکعت رہ جائے گی۔ لیکن امام کے لئے قصر جائز نہیں۔ ارشاد قرآن ہے

ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بھا وابتغ بین ذٰلک سبیلا (۱۷/۱۱۰)

اور نماز میں اپنی آواز بلند کر اور نہ آہستہ بلکہ بلندی و پستی میں معتدل راستہ اختیار کر۔

فرائض نماز میں دو رکعت میں تو قرآن قرأت سے پڑھا جاتا ہے لیکن ایک یا دو رکعت جہاں زائد ہے ان میں خاموشی سے پڑھتے ہیں

ناممکن ہے کہ کوئی کتاب ان تمام حالات پر حاوی ہو جو تا قیامت رونما ہوں گے۔ قرآن حکیم چونکہ محکم کتاب ہے اس میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں تغیر و تبدل ہو سکے اس لئے اس میں ایسے احکام کا مذکور نہیں جو روزانہ بدلتے ہیں۔ اور بدلنے چاہئیں۔ ایسے احکام کا وضع کرنا شوریٰ کے عقل و فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ازمنہ تاریک جن کو لسان قرآن میں "ایام جاہلیت" سے تعبیر کیا گیا ہے چند خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عام فہم انسانی بالغ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ایام میں اپنے بندوں کی سرپرستی انبیاء سے فرمائی، یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہی تھا۔ ان ایام میں احکام یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صادر کرنا یا وضع کرنا انبیاء کا کام تھا۔ آنحضرتؐ کی بعثت پر ایام جاہلیت کا خاتمہ ہوگیا۔ وقتی احکام کا وضع کرنا اب ایک جماعت کے ذمہ ہوا جسکو شوریٰ کہتے ہیں۔ خود آنحضرت اہل شوریٰ سے مشورہ کرتے۔ خلافت راشدہ میں بھی مشاورت جاری رہی آنحضرتؐ کو حکم الٰہی ہوا کہ "شاورھم فی الامر"۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں مشاورت سے امور طے ہوں وہاں "وحی" کا دخل نہیں عقل و فہم سے بھی امور طے ہوں گے، لیکن یہ سب وقتی ہی ہوں گے۔ لیکن ہمارے مولانا عجیب دل و دماغ کے آدمی ہیں وہ احادیث کو مثلہ معہ بلکہ قرآن پر قاضی اور حکم بھی سمجھتے ہیں۔ اور ایک اصطلاح وضع کی ہے "وحی خفی" یعنی احادیث وحی تو ہیں "متلو" نہیں "خفی"۔ یعنی آنحضرتؐ نہ تو بشر تھے اور نہ کبھی اپنی بشری عقل و فراست سے کام لیا۔ جو کچھ کہتے وحی تھا۔ اگر کبھی آنحضرتؐ نے ایک حلال شے کو حرام قرار دے لیا تو ایک حضرت یہ فرماتے ہیں کہ یہ وحی کی غلطی تھی، کیونکہ نبی تو کسی حالت میں بھی وحی سے خالی نہیں ہوتا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ قرآن کی مثل تمام جن و انس جمع ہو کر بھی نہیں بنا سکتے۔ اگر احادیث قرآن کی مثل ہیں تو دعویٰ قرآن کی نسبت کیا کہا جائے گا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

کیا قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ غیر اللہ کی تصنیف ہوتی تو اس میں اختلاف کثیر پاتے۔

اگر احادیث قرآن کی مثل ہیں تو آنحضرتؐ غیر اللہ نہ ہوئے، لیکن ان میں اختلاف کثیر ہے اس لئے یہ غیر اللہ کا کلام ہی ہوگا۔ ہمیں ان مولاناؤں سے الجھنے کی ضرورت نہیں، اللہ کے فضل و کرم سے یہ دیو سو یہ ختم ہو جائیں گے۔ ہم مقام رسول کریمؐ کا پتہ بتاتے ہیں اور یہ ختم نبوت میں ہے۔ ایام جاہلیت میں جمہور بمنزلہ صفر تھے۔ تواریخ میں مذکور ہے تو صرف انبیاء و ملوک کا جو امم سابقہ میں گذرے یا رشی اور منی اور راجوں اور مہاراجوں کا جو امم آریہ میں تھے۔ آنحضرتؐ نے جمہور کا درجہ بلند کیا، اور نبوت و ملوکیت ختم کر دی۔ غور کرنا چاہئے کہ قرآن میں "صدیق" حضرت ابراہیمؑ اور ادریسؑ کو کہا گیا ہے، حضرت مسیحؑ "شہید" ہیں، آپ کی والدہ "صدیقہ" ہیں۔ والدہ کا درجہ مولود سے بلند تر ہے۔ درجات اعمال کی وجہ سے حاصل ہوتے۔ نبوت وہبی ہے، لیکن اصحاب رسول کریمؐ عام صدیق اور شہید ہیں ارشاد ہوا،

اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم (۵۷/۱۹)

وہ صدیق اور شہید اپنے پروردگار کے ہاں ہیں ان کیلئے ان کے اعمال کا اجر ہے اور اس کا نور ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر انبیاء کا کام تھا اب امت مسلمہ کا ہے۔ انبیاء صدیق و شہید و صالحین تھے۔ لیکن ہمارے خاتم النبیینؐ کا مقام

محمود ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے لیکن تفہیم و تفہیم کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

آخر میں یہ تشریح بے محل نہ ہوگی کہ قرآن عظیم توراۃ کی طرح کتاب احکام نہیں۔ لیکن جامع و مانع کتاب اصول احکام ہے اور احکام وضع کرنا سکھاتا ہے، احکام تو "الشافی" کے ہیں اور اگر بغرض تصدیق ان کے حوالہ کی ضرورت نہ ہوتی تو شاید قابل ذکر بھی نہ تھے، احکام کی حیثیت قرآن میں ثانوی ہے، قرآن عظیم کچھ اور شے ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر میں نے مفصل بحث علیحدہ کی ہے اسلئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ جنھیں ہم قوانین شریعت کہتے ہیں اور جو احادیث یا اقوال خلفا یا ائمہ دین میں مذکور ہیں وقتی احکام ہی تھے، اور کوئی مستقل شے نہیں ہیں۔ ایسے قوانین زمانی اور خارجی حالات کے مناسب ان اصول کے تحت جن کی جامع و مانع کتاب قرآن ہے وضع ہونے چاہئیں۔ آنحضرتؐ نے آیہ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ (پ۱۰) کی نسبت یہ اجتہاد فرمایا کہ قوتؔ تیر ول میں ہے اور بعض روایات کے مطابق تین بار یا سات بار تاکیداً فرمایا۔ یہ اجتہاد وقتی ہی تھا۔ اسی طرح شوریٰ اپنے ہی زمانہ کے حالات کے متعلق احکام وضع کرسکتی ہے۔ ہمارے پاس قرآن دائمی کتاب اصول ہے اور تفقہ فی الدین۔ جو تفقہ اور تدبر سے کام نہیں لیتا قرآن اسے مجرم ٹھہراتا ہے اور یہ حق ہر ایسے شخص کا ہے جو اس کا اہل ہو۔ مسلمانوں کے تنزل کا سبب یہی ہے کہ رجعت پسند ہیں۔ ارتقا میں رجعت ناممکن ہے اسلئے یہ صحیح ہے مجالس قانون ساز شوریٰ ہی ہیں اور اسلامی شوریٰ ہیں اگر ان کا اجتہاد ان اصول کے تحت ہو جو قرآن نے واضح فرمائے ہیں۔

مولانا ممدوح نے ضمناً اور بھی باتیں کہی ہیں مگر ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ مغرب نے اگر ترقی کی ہے تو ہم سے سیکھ کر اور ہم اگر اپنی پستی کی طرف گر رہے تو قرآن اور تفقہ فی الدین چھوڑ کر اور رجعت پسند بنکر پرانی لکیر پیٹتے رہے اور زمانہ کے ساتھ نہ بدلے۔

[محترم عثمانی صاحب کا مضمون ہماری نظر سے ابھی نہیں گزرا۔ لیکن محترم خواجہ عباد اللہ صاحب کے اشارات سے صاف ظاہر ہے کہ عثمانی صاحب نے کیا لکھا ہوگا۔ اور اگر ہمیں یہ اشارات نہ بھی ملتے تو بھی — ہم جانتے ہیں جو وہ لکھیں گے جواب میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محترم خواجہ صاحب کی نظر سے طلوع اسلام نہیں گزرتا ورنہ انھیں اس کا علم ہوتا کہ جزئیات سے قطع نظر، اصولی طور پر طلوع اسلام مسلسل و متواتر یہی کچھ کہتا چلا آرہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر محترم خواجہ صاحب کو اس کا علم ہوتا تو وہ ہماری طرح محترم عثمانی صاحب کے اشارات کے جواب کی بھی ضرورت نہ سمجھتے۔ ہمارے ان "علماء کرام" کو اس سے کیا واسطہ کہ زمانہ کے حالات کیا ہیں، اور وقت کے تقاضے کیا۔ انھیں اس سے بھی کیا تعلق کہ قرآن انسانیت کے لئے کیا چاہتا ہے اور اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ انھیں تو فقط اس سے غرض ہے کہ جن اسلاف کو انھوں نے ارباب من دون اللہ قرار دے رکھا ہے ان کی معبودیت میں فرق نہ آنے پائے۔ اور یہ اس لئے کہ ان کی "معبودیت" میں خود ان کی بزرگی کا راز مضمر ہوتا ہے — بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم۔ طلوع اسلام]

باب المراسلات

نمازوں کی تعداد

راولپنڈی سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

یہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ ان سے ذکر آیا کہ وحی صرف قرآن شریف ہے اور کوئی وحی نہیں تو انھوں نے فرمایا کہ اگر تم وحی خفی (یعنی وحی غیر متلو) کے منکر ہو تو بتاؤ کہ پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر قرآن کریم میں کہاں ہے؟ ان کا ارشاد ہے کہ یہ وقت رسول اللہؐ نے وحی خفی کی بنا پر مقرر فرمائے تھے۔

طلوع اسلام

یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن کریم میں کیا کچھ ہے۔ سردست آپ اتنا دیکھئے کہ اس وحی غیر متلو کی حقیقت کیا ہے جس کی رو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ نمازیں شب معراج میں فرض ہوئی تھیں اس کی تفصیل خود بخاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

انس بن مالک کا قول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی تھیں لیکن جب میں (واپس ہو کر) موسیٰؑ کی طرف سے گذرا تو انھوں نے دریافت کیا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے۔ میں نے کہا پچاس وقت کی نمازیں۔ وہ کہنے لگے اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ کیونکہ تمہاری امت میں اس کی طاقت نہ ہوگی۔ میں نے جا کر اپنے رب سے کمی کرائی تو خدائے تعالیٰ نے آدھی ساقط کر دیں۔ جب میں موسیٰؑ کے پاس آیا تو ان سے کہا کہ آدھی ساقط کر دی گئیں تو انھوں نے کہا کہ دوبارہ اپنے رب کے پاس جاؤ تمہاری امت میں اس کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ میں نے خدا سے اور کمی کرائی۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض رہیں اور وہ ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ میرے ہاں حکم میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب میں موسیٰؑ کی طرف لوٹا تو انھوں نے کہا کہ اب کے پھر اپنے رب کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ (بخاری کتاب ۴۹)

غور فرمایا آپ نے کہ پانچ نمازیں کس طرح فرض ہوئیں۔ اللہ میاں حکم دینے والے اور حضور نبی اکرمؐ اس حکم کو امت کی طرف لانے والے۔ خدا نے پچاس نمازوں کا حکم دیدیا اور رسول اللہؐ اس حکم کو لے کر چلے آئے۔ نہ خدا کو (معاذ اللہ) اس کا احساس ہوا کہ میں کیسا ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں نہ رسول اکرمؐ کو اس کا خیال گذرا کہ میری امت اس بوجھ کو کیسے اٹھائے گی۔ اگر ان کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰؑ کو ہوا۔ ان کے کہنے پر رسول اللہؐ کو بھی خیال ہوا کہ بات واقعی ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ واپس تشریف

لے گئے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس کا احساس ہوا کہ حکم میں واقعی زیادتی تھی۔ چنانچہ ایک دو بھی نہیں، اکٹھی آدھی نمازیں ساقط ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے سمجھ لیا کہ اب حکم مناسب ہے اور رسول اللہ بھی مطمئن ہو گئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ پھر اللہ میاں کے پاس تشریف لے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو پھر اپنے حکم کی زیادتی کا احساس ہوا تو پچیس سے پانچ رہ گئیں۔ چنانچہ حضورؐ پھر مطمئن ہو کر واپس تشریف لے آئے لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر فرمایا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ اس پر رسول اللہؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ نہیں! میں سمجھتا ہوں اب حکم ٹھیک ہے۔ بلکہ فرمایا یہ کہ (آپ کہتے تو ٹھیک ہیں لیکن میں کیا کروں) مجھے بار بار جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس لئے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔

غور فرمایا آپ نے کہ دین کے محکم احکام کس طرح متعین ہوتے تھے! ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ کسی وقت ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس قسم کی باتیں جب غیر مسلموں کے سامنے آتی ہوں گی تو ہمارے خدا اور خدا کے رسول (علیہ التحیۃ والسلام) کے متعلق کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے؟ اس روایت سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ اس سے حضرت موسیٰؑ کی افضلیت ثابت ہو جائے اور مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ (معاذ اللہ) یہ ہے ہمارے پیغمبر کے سامنے تمہارے رسول کی حیثیت! لیکن ہمیں یہودی پر کیا گلہ! اس کا تو یہ کام ہی تھا۔ مسلمانوں سے پوچھئے جو ان چیزوں کو ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور جب کوئی ان کی طرف اس طرح توجہ دلاتا ہے تو اس پر بری طرح برس پڑتے ہیں۔

لیکن اب یہ چیزیں زیادہ عرصہ رہ نہیں سکتیں۔ اگر مسلمانوں نے انھیں اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے رکھا تو یہ چکّی کے پاٹ کی طرح انھیں بھی ساتھ لے ڈوبینگی اور اس کے بعد وہ قوم آئے گی جو قرآن کی شعلِ ہدایت کی روشنی میں تمام انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لے جائے گی۔

بہرحال یہ ہے نمونہ اُس "وحی خفی" کا جس کی رو سے ہمارے مولوی صاحبان کے مذہب کے مطابق وہ احکام متعین ہوا کرتے تھے جن کا ذکر انھیں وحی جلی (قرآن کریم) میں نہیں ملتا۔

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

۲) ناسخ و منسوخ

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:-

آیۂ رجم سے متعلق ایک صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی سینکڑوں آیتیں ایسی ہیں جو منسوخ ہیں یعنی وہ قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر ایک آیت ایسی بھی ہے جس کا حکم موجود ہے لیکن آیت کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے تو اس میں کیا قیامت ہے! ان سے کہا کہ میں نے تو قرآن میں کہیں نہیں پڑھا کہ فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ کر دی گئی ہے اور فلاں آیت فلاں سے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ نہیں! قرآن میں اس طرح نہیں لکھا۔

لیکن علماء صاحبان جانتے ہیں کہ کونسی آیت کس آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ کس قسم کا قرآن ہے جس میں اس طرح ناسخ و منسوخ احکام ہیں حالانکہ اس طرح تو کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون میں بھی نہیں ہوتا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ جب خود قرآن میں یہ موجود ہے کہ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا (سورہ بقرہ) یعنی "جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی (آیت) اور لے آتے ہیں" تو پھر آپ اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔

کیا آپ تفصیلاً تحریر فرمائیں گے کہ یہ کیا معمہ ہے! جشت پر

طلوعِ اسلام

ہمارے موجودہ "مذہب" کی کونسی بات معمہ نہیں جو آپ کو اس معمہ پر اس قدر اچنبا ہوا۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است! قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ ان صاحب کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب سے روایات وجود میں آئیں اور اس وقت تک چلا جائے گا جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا (۲:۱۷۰) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مسلک کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی مسلکِ تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے بیشتر حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ سمجھی جاتی ہیں۔

نسخ کے ثبوت میں قرآن کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ اگر آپ اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لائیں تو اس کے بعد آپ فی الواقعہ حیران ہوں گے کہ یہ آیت اس قسم کے عقیدہ کی دلیل کس طرح بن سکتی ہے! لیکن قرآن کے ساتھ تو مسلمانوں نے یہ کیا کہ پہلے غیر قرآنی عقائد وضع کئے اور پھر ان کی سند کے لئے قرآن کی کھینچا تانی کی گئی۔

بات بالکل واضح تھی۔ قرآن کریم کا دعوٰے ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنہیں وہ اپنی آسمانی کتابیں کہتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی منسوخ کر دیتی تھی اور ان کی جگہ ان سے بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانہ کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرامؑ کی وحی اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتی تھی۔ ان میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا اور ان کا اکثر حصہ حوادثِ ارضی و سماوی کی وجہ سے، یا خود انسانی دسیسہ کاریوں کے باعث، ذہنوں سے فراموش ہو جاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسول، اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کر کے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے ان تمام سابقہ احکام کو جو

وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے، منسوخ کر دیا اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دیدیئے جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ اور سابقہ انبیاء کرام کی تعلیم کا وہ حصہ جو فراموش کر دیا گیا تھا لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا، دوبارہ لے آیا۔ اب اہلِ کتاب کی یہ حالت تھی کہ وہ قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں۔ (یعنی جنہیں قرآن نے منسوخ کر دیا تھا اور ان کی جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی)۔ یا ایسی باتیں جن کا ان کی کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا جو ان کے پاس موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہو چکا تھا اور جسے قرآن دوبارہ لایا)۔ چنانچہ وہ اس کیفیتِ حال کو بطورِ اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اُسی خدا کی طرف سے ہے جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں تو پھر قرآن بعینہٖ ان کی کتابوں جیسا کیوں نہیں۔ اس کے جواب میں قرآن نے یہ بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے کہ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا۔ کہ ہم جن سابقہ احکام کو منسوخ کر دیتے ہیں ان کی جگہ جدید نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں۔ اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کارفرما ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں منکرینِ قرآن کا یہ اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ۔ واللہ اعلم بما ینزل۔ قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون (۱۶/۱۰۱)

جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں۔ اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسول) تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے (کیونکہ یہ ان کتابوں سے الگ ہے جو ہمارے پاس ہیں)۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں (کہ وحی کا اسلوب کیا ہے)۔

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔ اسی "تنسیخ آیات" یا تبدیلیٔ احکامِ سابقہ کے متعلق سورۂ رعد میں ہے۔

وما کان لرسول ان یاتی بآیۃ الا باذن اللہ۔ لکل اجل کتاب۔ یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب۔ (۱۳/۳۸-۳۹)

کسی رسول کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی پیغام لے آتا۔ (خدا کا قانون اس باب میں یہ ہے کہ) ہر میعاد کیلئے ایک حکم معین ہے۔ سو (اس قانون کے مطابق) اللہ جس (پیغام) کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔

اور یہ سب کچھ اس اصلِ کتاب کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو تغیرات سے ماوراء ہے۔

یہ تو ہوا پیغاماتِ سابقہ کی جگہ دوسرے پیغامات لانے کی بابت۔ یعنی تنسیخِ احکاماتِ سابقہ۔ اب لیجئے آیتِ زیرِ نظر کا دوسرا حصہ یعنی "او ننسھا" (یعنی جو پیغامات فراموش کر دیئے جاتے ہیں) اس کے متعلق خود قرآن شاہد ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں کا

کتاب کا بڑا حصہ فراموش کر رکھا تھا۔[1] سورۂ المائدہ میں پہلے یہود کے متعلق ہے کہ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظاً مما ذکروا بہ (۵/۱۳)۔ یعنی وہ الفاظ کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں (تحریف) اور جو کچھ انہیں ذکر کے لئے دیا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انھوں نے فراموش کر دیا ہے۔ یہی الفاظ اس سے اگلی آیت میں نصاریٰ سے متعلق کہے گئے ہیں۔ یہ لوگ پیغاماتِ خداوندی میں اس طرح تحریف والحاق کرتے لیکن اللہ تعالیٰ پھر ایک رسول بھیجکر، ان کی تحریف والحاق کو چھانٹ پھٹک کر الگ کر دیتا اور اپنے اصل پیغام کو پھر اس کی جگہ رکھدیتا ہے۔ سورۂ حج میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا؛

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنّٰی القی الشیطٰن فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطٰن ثم یحکم اللہ اٰیتہ۔ واللہ علیم حکیم۔[2] (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ اس کے تلاوت کردہ (پیغامِ خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ نہ ملا دیا ہو۔ (شیاطین یہ کرتے تھے لیکن) اللہ شیطان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا اور اپنے پیغام کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علم والا، محکم پیغامات رکھنے والا ہے۔

امید ہے کہ ان اشارات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ "ما ننسخ من آیۃ" الخ کی آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے! اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے؟ یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات، روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ لیکن مُلّا بیچارے کو اس سے کیا واسطہ کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور رسول کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں کہیں فرق نہ آ جائے خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات۔ مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات۔ مُلّا کے نزدیک جو کچھ "کتاب میں چھپا ہوا" ہے، سند ہے۔ باقی رہا قرآن، سو وہ مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے ہے یا اس لئے کہ "از یٰسین او آساں بمیری"۔ خدا نہ کرے کہ پاکستان کے مسلمانوں کے آئین و دستور کا کام ان کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ یٰلیتنی مت قبل ھٰذا وکنت نسیاً منسیا۔

---

[1] اس کی تاریخی تفصیل معراجِ انسانیت کے سب سے پہلے باب "ظہر الفساد" میں دیکھئے جہاں سے معلوم ہوگا کہ جن کتابوں کو آسمانی کہکر پکارا جاتا ہے ان کی حقیقت کیا ہے؟

[2] ہمارے مفسرین نے اس آیۂ جلیلہ کی تفسیر میں، اس قسم کی رنگ آمیزیاں کی ہیں اور حضور نبی اکرمؐ کی طرف اس قسم کی لغو باتیں منسوب کی ہیں کہ جن کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے۔ اور ان سب خرافات کا مبنیٰ روایات ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری

لاہور سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام، تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری قرار دیتا ہے اور اس طرح وحدتِ حیات سے ایک عالمگیر اخوت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ لیکن باقی مذاہب والوں سے بات کیجئے (بالخصوص عیسائیوں اور ہندوؤں سے) تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کے ہاں تمام انسانوں کو ایک ایک برادری بنایا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اسلام کا یہ دعوےٰ اپنے اندر کیا خصوصیت رکھتا ہے!

طلوعِ اسلام

کہنے کی بات کا تو یہ عالم ہے کہ آج کل یہ فیشن ہو رہا ہے کہ کوئی اہم نظریہ سامنے آئے، ہر مذہب اور تہذیب کے مدعی فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہاں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نظریات و اصولات کی دنیا تو ایک طرف محسوسات کی دنیا تک میں یہی حالت ہے۔ چنانچہ آپ نے عام ہندوؤں کو کہتے سنا ہوگا کہ ہوائی جہازوں کا ذکر رامائن میں ہے اور مہاراج بھرت نے ہنومان کو ہوائی جہاز کے ذریعے اجودھیا سے لنکا پہنچایا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر انگریز ہندوستان میں نہ آتا تو بھارت دیش کے راجاؤں تک کو بہلیوں سے بڑھ کر کوئی سواری نصیب نہ ہوتی۔ لہٰذا تحقیقی دلیل یہ نہیں کہ کوئی کیا کہتا ہے۔ دلیل کی اصل یہ ہے کہ مدعی کی مزعومہ آسمانی کتاب میں کیا لکھا ہے۔ ہندو تو کبھی اس باب میں سامنے آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے، جن کے ہاں بھارت ورش کے باہر انسان نہیں ملیکش بستے ہوں، اور خود بھارت کے اندر، ہندو جاتی میں برہمن، کھشتری، شودر اور دیش کی ازلی اور پیدائشی تقسیم موجود ہو۔ اور جن کے ہاں اچھوت حیوانات سے بدتر سمجھے جاتے ہوں اور یہ سب کچھ ویدوں اور سمرتیوں کی تعلیم کے مطابق ہو رہا ہو۔ انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانیت کی عالمگیر برادری کا نام بھی لے سکیں۔ باقی رہے عیسائی، سو ان کے ہاں واضح الفاظ میں موجود ہے کہ خدا کا پیغام صرف قومِ بنی اسرائیل کے اندر محصور رہے گا۔ غیر بنی اسرائیل تک اس پیغام کا ایک لفظ تک نہیں پہنچایا جائے گا۔ انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیح نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو

> انھیں حکم دیکر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی۔ باب ۱۰۔ آیات ۵-۶)

اسی کی تفسیر میں دوسری جگہ ہے:

> پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ (متی ۷)۔

سو ظاہر ہے کہ جس تعلیم کی مخاطب صرف ایک قومِ بنی اسرائیل ہے اس میں انسانیت کا عالمگیر تصور کہاں سے آسکتا ہے؟ یہ قرآن ہے جس نے "یا ایھا الناس" (اے نوعِ انسانی) کے تخاطب سے تمام انسانیت کو دعوت دی۔ اس نے خدا کو رب العالمین، قرآن کو ذکر للعالمین اور رسول کو کافۃ للناس (تمام نوعِ انسانی کی طرف رسول) کہہ کر پکارا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے تمام نوعِ انسانی کی پیدائش کا سرچشمہ "نفسِ واحدہ" قرار دیکر صرف نظری اعتبار سے نہیں بلکہ بطور ایک حقیقت نفس الامری کے وحدتِ انسانیت کا

اعلان کیا۔ اگر کسی اور مذہب میں اس حقیقت کا ذکر ہے تو اسے کہئے کہ فأتوا برهانكم ان كنتم صادقين۔ ورنہ زبانی دعاوی میں کون پیچھے رہتا ہے؟۔

انتخابات

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء کے طلوعِ اسلام میں مردان سے جی ڈی صابر صاحب نے انتخابات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ــــ صابر صاحب دور کی کوڑی لائے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ "لوگوں کے حلقے" طبقاتی شکل میں بنائے جائیں اور اس طرح سے صحیح نمائندہ اسمبلی کے لئے منتخب ہو سکے گا۔

صابر صاحب نے جدت تو خوب کی ہے لیکن انھیں اس سادہ اصول کے ماننے میں کیوں تامل ہے کہ جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح سے طبقاتی کشمکش کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے۔ اب تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسلام جاگیرداری اور سرمایہ داری کی تنسیخ کا حکم دیتا ہے اور اگر یہ اصول تسلیم کیا جائے تو "طبقاتی حلقے" بنانے کی ضرورت ہی نہیں رہیگی۔

جناب صابر صاحب نے ایک بات بڑے مزے کی کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ووٹ کا حق صرف تعلیم یافتہ حضرات کو دیا جائے۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ ایک طرف تو جناب صابر صاحب نے طبقاتی حلقے بنانے کی سفارش کرتے ہیں، اور دوسری طرف وہ عوام سے ووٹ کا حق چھینتے ہیں۔ آخر پاکستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب کیا ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے صاحبزادے یا متوسط طبقے کے نوجوان جنھوں نے کلرک بننے کیلئے محض اتنی تعلیم حاصل کی ہے۔

صابر صاحب نے نیک ارادے سے ہی سہی ایک خطرناک ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے بالواسطہ سرمایہ داروں کی قیادت کی تائید ہوتی ہے۔ ــــ صابر صاحب کا دعویٰ ہے کہ ووٹ کا حق تعلیم یافتہ حضرات کیلئے "ریزرو" کرنے سے لوگوں میں تعلیم کا شوق بڑھ جائے گا۔ اگر وہ ایمانداری سے عوام کو Educate کرنا چاہتے ہیں تو اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ "استحصالی قوتوں" کا قلع قمع کر دیا جائے اور جب زمین اور سرمایہ Nationalise کیا جائے تو پھر عوام کو مفت اور لازمی تعلیم دینا حکومت کا فرض ہو جاتا ہے اور اس طرح سے یہ مقصد بخوبی حل ہو جاتا ہے۔

میں بھی مردان کا باشندہ ہوں اور میرا دعوےٰ ہے کہ مردان کے لوگ (کم از کم) سیاسی طور پر بہت بیدار ہیں۔ اور اس دعوے کے ثبوت میں میں "کمال زئی سیٹ" کا وہ معرکہ آرا مقابلہ پیش کرتا ہوں جسے ڈاکٹر خاں نے دہلی سے بڑے طمطراق سے چیلنج کیا تھا لیکن مردان کے ان پڑھ عوام نے کانگریس کے سیاسی تابوت میں آخری کیل گاڑ دی تھی۔ کیا یہ ان پڑھ عوام کی سیاسی بیداری کا بین ثبوت نہیں؟

ہاں البتہ بوگس لوگوں کو عوام کے نام نہاد نمائندے بننے سے صرف اس طرح روکا جا سکتا ہے کہ عوام کی محنت پر پلنے والے کرگسوں کا قلع قمع کیا جائے۔

قمر راہی - کراچی

احساس، آواز سننے کی قابلیت اور مادی ماحول کا علم نہیں ہوتا اس لئے عذاب قبر کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ وہ عذاب قبر نہیں جو قبر کی چہار دیواری میں ہوتا ہے بلکہ وہ عذاب جو عالم خیال، عالم مثال سے وابستہ ہے اور نگاہوں کی زد میں نہ آسکنے کے باوجود کارخانہ ہستی کے عذاب سے پوری پوری مشابہت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر شعور، احساس اور آواز سن سکنے کی قابلیت نہ رہنے کے بعد کوئی لذت والم محسوس نہیں کیا جا سکتا، تو کیا خواب میں جہاں نہ احساس ہوتا ہے، نہ شعور نہ کچھ اور[1] آپ طرح طرح کے مناظر سے لذت والم کا احساس نہیں کرتے؟ کیا ڈراؤنے خواب آپ کو لرزہ براندام نہیں کرتے؟ کیا خوشگوار خواب کی لذت آپ کے دل ودماغ پر عرصہ تک نقش نہیں رہتی؟ اور کیا خارجی دنیا سے بالکل بے خبر ہوتے کے باوجود وہ واقعات جو حال و مستقبل سے گذر رہے یا گذرنے والے ہوتے ہیں آپ کے پردۂ خیال[2] پر ایک تمثیلی شکل میں نقش نہیں ہو جاتے؟ میں سوال کرنے والے سے سوال کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود آپ کو یہ کیونکر غلط فہمی ہوگئی کہ شعور و احساس زندگی کی ان صداقتوں میں سے ہیں جن کے بعد خود زندگی ہی میں کوئی صداقت نہیں رہ سکتی؟ کیا آپ نے تحت الشعور اور "لاشعور" کی تحقیقات ملاحظہ نہیں فرمائیں؟ کیا لاشعوری" ہو جانے پر بھی رجحانات مٹ جاتے ہیں؟ کیا "لاشعور" کے پس پردہ بیدار شعوری کارفرمائیوں کا آپ کو بالکل اندازہ نہیں؟ کسی شبہ کا پیدا ہو جانا جرم نہیں مگر جب تک شبہ میں گہرائی نہ ہو اُسے کوئی خاص قیمت نہیں دی جا سکتی۔

یہاں تک گذارش کے بعد میں علامہ اسلم جیراجپوری صاحب کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں، جن کی ساری زندگی قرآن کے مطالعہ میں گذری ہے اور جو اتنا وسیع مطالعہ کرنے کے باوجود برزخ کا انکار فرما رہے ہیں۔

سب سے پہلی آیت جس سے برزخ کا ثبوت ملتا ہے وہی آیت ہے جسے حضرت علامہ پیش فرما چکے۔

ومن وراءهم برزخٌ الی یوم یبعثون۔

اور ان کی زندگی کے بعد دوسری زندگی کے دھارے کو الگ رکھنے والی آڑ ہے انسانی زندگی کو حرکت میں لانے اور نمایاں کرنے والے انقلاب تک۔

آیت صاف بتا رہی ہے کہ قرآن برزخ اور ایک آڑ کا ضرور قائل ہے[3]۔ مگر برزخ کو "رب کی حضوری" سے آڑ میں رکھنے والی چیز قرار دینا نہ معلوم کیا اصطلاحی یا لغوی بنیاد رکھتا ہے۔ قرآن نے موجودہ زندگی سے "یوم یبعثون" تک کے درمیانی وقفہ کو برزخ قرار

---

[1] حال کی نفسیاتی تحقیق کے مطابق خواب میں شعور کامل طور پر معطل نہیں ہوتا۔ کلوروفارم کے زیر اثر شعور یکسر معطل ہو جاتا ہے اور اس میں نہ خواب آتا ہے نہ اس کے خوشگوار و ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے موت کے بعد کی حالت کو خواب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

[2] خواب میں پردۂ خیال تو کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ موت کے بعد پردۂ خیال اسی طرح سرگرم رہتا ہے۔

[3] علامہ اسلم صاحب خود اس آڑ کے قائل ہیں لیکین اس آڑ کی حالت میں شعور و احساس کے قائل نہیں کیونکہ اس کا انہیں قرآن سے ثبوت نہیں مل سکا۔ (طلوع اسلام)

دیا ہے۔ سمندر کی برزخ کے ہم رنگ۔ گویا کہ برزخ کا تخیل اس کے نزدیک دو چیزوں کے درمیان والی چیز ہے۔ اِدھر موجودہ زندگی ہو اور اُدھر آئندہ زندگی۔ لیکن "حضوری" کا تصور صرف ایک سمت رکھتا ہے۔ مستقبل کی سمت۔ ماضی کی سمت اس میں قطعاً نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں برزخ کے تذکرہ میں رب کی حضوری کو شامل کرنا جبکہ سیاق و سباق سادہ طور پر دو زندگیوں کے درمیانی وقفہ کو پیش کر رہے ہوں تفسیر قرآن بالقرآن نہیں تفسیر بالرائے ہے۔ صرف آخرت میں خدا کی حضوری کا تصور دراصل صرف عوامی ذہن کی حد تک ایک چیز ہو سکتا ہے۔ ورنہ کیا آج خدا "اقرب من حبل الورید" (شہ رگ سے زیادہ قریب) نہیں، کیا اس کی گرفت مادی زندگی میں قوموں کو تباہ نہیں کر رہی؟ آخر دوسری زندگی میں وہ کیا خصوصیت ہے جو موجودہ زندگی میں نہیں، اور جس کے پیش نظر رب کی حضوری کا تصور شامل کیا گیا۔ اگر حشر پر سیر حاصل بحث کر لی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارے ضمنی مباحث صاف ہو جائیں گے[1]۔ یہ چیز بھی صاف ہو جائے گی کہ کیا موجودہ اور نئی زندگی کے درمیان زندگی کا فلمی ریل کٹ جانا اور مادہ پرستوں کے دعوے کی تصدیق کر دیتا ہے یا زندگی کا تسلسل قائم رہتا اور اس چیلنج کو ٹھوس حقیقت میں تبدیل کر دیتا ہے، جو مابعد الطبیعاتی نظریات کی طرف سے ہمیشہ دیا جاتا رہا اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ توہم پرستانہ روایات سے انکار کرتے ہوئے مذہبی حقائق کو کیونکر قابل تسلیم بنایا جا سکتا ہے۔

بہرحال اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سمندر کی شور اور شیریں لہروں پر کنٹرول رکھنے کے لئے ایک طاقت اور ایک قانون کام کرتا ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہی قانون اور وہی طاقت زندگی کی دونوں دھاروں کو الگ الگ بہہ سکنے کی سہولت نہ دے رہی ہو۔ اور اُن مخصوص پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے جو پانی اور زندگی کی لہروں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر رہے ہیں۔ عبوری دور زندگی میں ہمیشہ ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک آڑ ہی ہوتا ہے[2]۔ نہ ماضی چھلانگ لگا کر مستقبل کی موج بن سکتی ہے نہ مستقبل ماضی کی لہروں میں گم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عبوری دور کے تقاضے دونوں سے الگ ہوتے ہیں اور اُس ہی امتیاز کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں قوم عبوری دور سے گذرتی ہوئی مستقبل اور نئی زندگی تک بڑھ رہی ہے اس لئے اگر عبوری دور کو برزخ اور آڑ کہا گیا تو اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اس عبوری دور میں مادی شعور سے قطع نظر کرتے ہوئے تخیلی شعور بھی نہ ہوتا تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کہ

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیآءٌ عند ربھم یرزقون۔

جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انھیں مردہ نہیں خیال کرنا چاہئے وہ اپنے نشوونما دینے والے کے پاس زندہ بھی ہیں اور نشوونما کے ذرائع سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں

---

[1] ہم محترم حکیم صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہی اس بحث کا آغاز فرما دیں۔

[2] اگرچہ اس بحث کا برزخ سے تعلق نہیں لیکن چونکہ محترم حکیم صاحب اسکی مثال دی ہے اسلئے اتنا گذارش کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کہ ماضی اور مستقبل کے درمیان کوئی عبوری دور نہیں ہوتا۔ جسے ہم حال کہتے ہیں تصور زماں میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ (طلوع اسلام)

یہ کہنا کہ "عند ربہم" کہنے سے برزخ کی نفی ہوگئی ایک عجیب سی بات ہے۔ خدا کے پاس جانے سے آخر کیا مطلب؟ شہید ہونے والے کہاں چلے جاتے ہیں؟ کیا شہیدوں اور اپنی موت مرنے والوں کے لئے قرآن نے نئے نئے عالم اور نئے نئے منازل کا دعوی کیا تھا؟[1] مرنے کے بعد قرآن صرف برزخ کا ذکر کرتا ہے، خواہ وہ شاعرانہ تخیل ہو یا ایک ٹھوس حقیقت۔ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا اشارہ تک بھی نہیں پایا جاتا۔ قرآن نے کب بتایا تھا کہ اگرچہ برزخ میں زندگی نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی نیک آدمی برزخ کو چھلانگ کر اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جائے تو اسے زندگی نصیب ہو جائے گی؟ شہیدوں کی زندگی سے کوئی ایسا تصور پیش نہیں کیا گیا تھا جس سے انسانیت ناآشنا ہو۔

مردہ قوم اور زندہ قوم سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایک سانس لے رہی ہے اور روٹی کھا رہی ہے اور دوسری قوم نہ سانس لے سکتی ہے، نہ روٹی کھا سکتی ہے۔ زندگی ان وسائل کا نام نہیں جن کے سہارے زندگی نمایاں ہوتی، پھیلتی اور بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے بلکہ اس قوت کا نام ہے جسے تخلیق کی گوناگوں صلاحیتوں کے پیچھے کام کرتے ہوئے آپ محسوس کر رہے ہیں۔ جس قوم میں انسانی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے والی طاقت بیدار ہوگی وہ زندہ ہے، ورنہ مردہ۔ بالکل یہی حال شہیدوں یا بالفاظ دیگر قانونِ قدرت کی نگرانی کرتے ہوئے جانِ عزیز تک دیدینے اور اپنے ہنگامی مفاد کے لئے زندگی کی ہر قدر کو ٹھکرا دینے والوں کا ہوتا ہے۔ بعد از مرگ اگر کوئی زندگی ہے تو انسانیت کی بیدار اور متحرک قوتوں کو نشو و نما پاتے رہنا چاہیے، ورنہ عبوری دور سے گذر کر انقلاب کے نئے تقاضوں تک انتظار کرنا پڑے گا جو کروڑوں سال تک دوبارہ زندگی کی مشنری کو حرکت نہیں دے سکتے۔

نہ معلوم یہ کیونکر اندازہ کر لیا گیا کہ موت کے بعد صرف شہید ہی خدا کے پاس جاتے ہیں۔[2] آخر کروڑوں آدمیوں کا مقام کونسا ہے؟ کیا انھیں شیطان کے پاس جانا پڑے گا؟ موت ہو یا زندگی خدا کی نزدیکی سے کوئی ابنِ آدم محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی کو زندگی کا ہر عیش نصیب ہوتا ہے اور کسی کو نہ موت ملتی ہے نہ رزق۔ قرآن نے "عند ربہم" سے اسی پہلو کو نمایاں کیا تھا۔ برزخ سے انکار نہیں کیا گیا۔

دوسری آیت جس سے عالمِ برزخ کی مرگ بدوش فضاؤں کا یقین دلایا جا رہا ہے حسب ذیل تھی:

والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئاً و ھم یخلقون اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون۔

وہ خدا کے سوا جسے پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں زندگی کی کوئی نشانی نہ رکھتے ہوئے نہ انھیں زندگی کے دوبارہ حرکت میں آنے کا شعور و اندازہ ہے۔

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شہیدوں کے علاوہ بزرگانِ دین سے لے کر پیغمبروں تک کسی کو بعد از مرگ زندگی نصیب نہیں ہوتی؟

[1] جب قرآن نے مقتولین فی سبیل اللہ کیلئے یہ تخصیص کر دی ہو تو ہم اسے عام حالات میں مرنے والوں پر کس طرح منطبق کر سکتے ہیں؟

[2] کیا قرآن نے "بل احیاء عند ربہم" شہداء کے علاوہ کسی اور کے لئے بھی کہا ہے؟ (طلوع اسلام)

کیا شہیدانِ ملت کے دلوں میں یقین کی آگ روشن کرنے والے پیغمبر بھی صرف اس لئے مردہ قرار دیدیئے جائیں گے کہ قرآن نے ان کی زندگی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی[1] اور "من دون اللہ" (خدا کے سوا) کے دائرہ میں وہ بھی شامل ہیں۔ اگر کسی فلسفہ سے پیغمبروں کو شہداء کی صف میں رکھا جاسکتا ہے تو "صدیقین" اور "صالحین" کو ان کی صف سے کیونکر نکالا جاسکے گا، جبکہ وہ بھی انعام یافتہ پارٹی کا ایک جزء ہیں؟ پیغمبروں کو نزولِ وحی کے علاوہ نیک عملی کی زندگی بسر کرنے والوں سے کوئی ایسا امتیاز حاصل نہیں ہوتا جس کے ذریعہ انہیں روحانی زندگی دیدی جائے اور دوسرے حضرات کو محروم کردیا جائے۔ قانونِ الٰہی کے لئے جان دینے کے ہزار انداز ہیں۔ ہر وہ شخص جو اپنا سب کچھ قانونِ الٰہی کی نگہبانی کے لئے لٹا دے کیا شہید کا مرتبہ نہیں پا سکتا؟ کیا اُسے خدا کی نزدیکی نصیب نہ ہوگی اور کیا نزدیکی سے ابھرنے والی زندگی اس کے رگ و ریشہ میں جذب نہیں ہوسکتی؟ صرف اس لئے کہ کسی مصیبت زدہ کی پکار نے اسے اپنا نشانہ بنایا تھا۔ ایک کا گناہ دوسرے کے کاندھوں پر کیسے لادا جارہا ہے۔ سوچئے اور بار بار سوچئے۔ در اصل ہمارے محترم علامہ کو اس تصور کے سمجھنے اور اس کی کیمیاوی تحلیل کرنے میں غلطی ہوئی جو شرک و بت پرستی کے بارے میں کفارِ عرب رکھتے تھے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ بت پرستوں کا مرکزی تصور روحانی طاقتوں ہی سے وابستہ ہوتا تھا۔ لیکن نہ روحانی طاقت کا کسی انسان سے وابستہ ہونا ضروری تھا، کیونکہ بے جان ستارے بھی پوجے جاتے تھے۔ اور نہ تنہا روح ہی کو سب کچھ خیال کیا جاتا تھا۔ مجسمہ اگرچہ ایک روحانی مظہر کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن توہم پرستی نے خود تخلیقی مجسموں کو بھی روحانی عظمت دیدی تھی۔ مجسموں کی توہین یا ان کی شکستگی سے بت پرست قوموں پر ہمیشہ وہی باز اثر مرتب ہوتا رہا جو کسی غیر محسوس طاقت کی ناکامی سے ظہور پذیر ہوسکتا تھا۔ بتانِ کعبہ کی شکستگی سے قبائل کے دل و دماغ پر جو اثر پڑا وہ صاف شہادت دے رہا ہے کہ بت پرستانہ ذہن کی ترکیب کیا تھی؟ اور روح کی پرستش کے ساتھ وہ مجسمہ کی کہاں تک پرستش کرتے تھے؟ قرآن اسی ترکیبی ذہن کے لحاظ سے ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالا کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں اس نے یہ بتایا تھا کہ پوجے جانے والے بت "کسی چیز کو پیدا تو کیا کرتے، خود ہی تخلیقی آرٹ کے زائیدہ ہیں نہ صرف اتنا ہی ہے بلکہ تراشۂ سنگ ہونے کی بنا پر زندگی کی کوئی علامت بھی ان میں نہیں پائی جاتی۔ ایسی حالت میں موت و حیات کی گردشوں پر وہ کیونکر قابو پاسکتے ہیں۔ اور جنہیں خود اپنی موت، جمود اور نفی سے گذر کر زندگی، حرکت اور ایجابی پہلو تک پہنچنے کا وقت نہ معلوم ہو وہ تمدنی انقلابات کے نازک ترین لمحات متعین کرکے تمہیں کیا خبردار کرسکتے ہیں[2]؟"

[1] علامہ اسلم یہی کہتے ہیں کہ قرآن نے صرف شہداء کی زندگی کا ذکر کیا ہے۔ اگر ان کے علاوہ کسی اور کی زندگی کا بھی قرآن نے ذکر کیا ہو تو اُسے پیش کرنا چاہیے۔

[2] لیکن یہ سب کچھ کہہ لینے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن نے ان انسانوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں کفار و مشرک پوجتے تھے وہ تو ایامِ جاہلیت تھے۔ کیا آج بھی ایسے انسان نہیں ہیں جن کی پرستش ہوتی ہے! طلوع اسلام

النار یعرضون علیہا غدوًّا وعشیًّا ویوم یقوم الساعۃ ادخلوا آل فرعون اشد العذاب۔ [سلہ]

آگ فرعون پارٹی پر صبح وشام پیش کی جاتی ہے اور جس دن تباہ کن گھڑی اپنی رونق پر آئیگی ان سے کہا جائے گا کہ سخت تر مشکلات کی زندگی میں داخل ہوجاؤ۔

یعنی دریائے نیل میں ڈوب جانے کے بعد فرعون پارٹی کو طرح طرح کی روحانی اذیتوں سے گزرنا پڑرہا ہے۔ تو ہم سب سے بہتر شعور رکھنے والے خدا سے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ کسی دوسری جگہ مبہم طور پر اس کا انکار کرے گا۔ اور ایک مومن آیت کا صاف مطلب سمجھ لینے کے باوجود خدا کی تائید میں صرف یہ دلیل پیش کرنے پر مجبور ہوجائے گا کہ "یہ مفہوم تمام دوسری قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے"۔ اگر واقعی تضاد بیانی سے کام نہیں لیا گیا تو آیت کا ترجمہ اور تفسیر اس طرح کیجئے کہ غلط فہمی دور ہوجائے ورنہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ تضاد بیانی موجود ہے، چاہے ہمارے جذبات اس سچائی کو گوارہ نہ کرسکتے ہوں۔ علیٰ ہذا یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن نے حشر سے پہلے وقفۂ مرگ میں کافروں کے جن گوناگوں احساسات کی ترجمانی کی ہے، کہیں ایک گھنٹہ، کہیں دن کا کچھ حصہ، کہیں ایک دن اور کہیں دس دن تک۔ اس سے برزخ کا انکار کیونکر ثابت ہوگیا۔ اگر ہم ایک منٹ کے خواب کو مہینوں کا وقفہ محسوس کرتے رہتے ہیں تو کیا اس سے خواب کی تخیلی ساخت کا انکار کرنا پڑے گا؟ وہ احساسِ وقفہ جو نہ قلبِ مومن کا احساس ہے، نہ قرآن اس کی صداقت کا معترف بلکہ صاف کہہ رہا کہ

کذلک کانوا یؤفکون

ایسے ہی وہ بھٹکائے جاتے ہیں۔

اس احساس پر برزخ کے اقرار وانکار کی بنیاد رکھنا کہاں تک درست ہوسکتا؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ پھر ان غلط اور متضاد احساسات کو نقل کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ ایک سنجیدہ سوال ہے۔ مگر اس کا جواب سب سے پہلے ان حضرات کو دینا چاہئے جو پہلے مفسرین کی گرد راہ سے بالاتر ہوچکے ہیں اور جنہیں علوم قرآنی سے گہری واقفیت ہے۔ میں ایک تشنہ لب انسان ہوں چشمۂ کوثر کہاں سے لاؤں!

برزخ کی بحث وگفتگو میں جن آیات کو پیش کیا گیا ہے ان پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ مگر میں صرف ایک چیز کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرونگا۔ مانا کہ برزخ کچھ نہیں، افسانۂ وخواب ہے۔ لیکن آخر یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ حشر کیا ہے؟ اس کے مذہبی تصورات میں جو علمی خامیاں ہیں انھیں کیونکر دور کیا جاسکتا ہے۔ اور کیا حشر بھی برزخ کی طرح ایک دوسرا عالم خیال اور ذہنی ونفسیاتی کائنات ہے؟ یا ہماری موجودہ کائنات کی طرح ایک ٹھوس اور مادی کائنات؟ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے اور علم وسائنس کی دنیا کو مطمئن کرسکنے کے لئے اس کے پاس کون سے پہلو ہیں؟

میرا خیال ہے کہ اگر حشر کے تصور کو صاف کردیا گیا تو برزخ کا مسئلہ خود سلجھ جائیگا ورنہ جو لوگ حشر ہی کے بنیادی مسئلہ کو

سلہ استدلال کے ملاحظہ فرمایئے۔ طلوع اسلام

صاف نہ کرسکتے ہوں انھیں برزخ پر بحث کرنا مناسب نہ ہوگا۔

امید ہے کہ ہمارے علامہ محترم اسلم جیراجپوری صاحب ورنہ کوئی دوسرے صاحب میری تشنگی کے لئے مداوا تلاش کرنے کی زحمت گوارہ فرماکر شکریہ کا موقعہ دیں گے۔

استدراک

محترم حکیم صاحب نے اپنے اس تنقیدی مقالہ میں علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کو براہِ راست مخاطب فرمایا ہے اس لئے اس کا جواب علامہ صاحب ہی کے ذمہ تھا۔ لیکن علامہ صاحب پاکستان میں نہیں ہیں اور غالباً طلوعِ اسلام بھی ان کی نظر سے نہیں گذر رہا (ہندوستان کے اکثر و بیشتر گوشے ایسے ہیں جہاں طلوعِ اسلام نہیں جاسکتا)۔ اس لئے ہمیں افسوس رہیگا کہ وہ اس بحث میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ مگر ہم نے محترم حکیم صاحب کے مقالہ میں بعض مقامات پر حواشی سے اپنے خیالات کے اظہار کی جرأت کی ہے۔ دو ایک مقام ایسے ہیں جن کے متعلق ذرا تفصیل سے عرض کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے طلوعِ اسلام میں شائع شدہ مراسلہ کے اخیر میں لکھا تھا۔ موضوع کا رُخ اس طرف تھا کہ مسلمانوں نے زیرِ زمین ایک دنیا بسا کر مردوں کی پرستش شروع کر رکھی ہے حالانکہ انھیں شعور و احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس حد تک محترم حکیم صاحب بھی متفق ہوں گے کہ مردوں کو یہاں کے زندوں سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا اور وہ نہ ان کی سنتے ہیں نہ ان کی کچھ مدد کرسکتے ہیں۔ اگر محترم حکیم صاحب اس سے متفق ہیں تو اصل مسئلہ کا یہیں فیصلہ ہوجاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے خود لکھا تھا، مسئلہ برزخ سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک زندگی، موت، قیامت، یوم بعث، حشر نشر، حساب، کتاب، عذاب، ثواب، جنت، دوزخ کی وہ حقیقت سمجھ میں نہ آجائے جسے قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہ فی الحقیقت زندگی کی ایک اصولی بحث ہے اور نہایت اہم۔ لیکن اس کے لئے طلوعِ اسلام کے محدود اوراق کس طرح متحمل ہوسکتے ہیں۔ سفینہ چاہئے اس بحرِ بے کراں کیلئے۔ بایں ہمہ اگر "کشاکشِ روزگار" (یعنی حال کے عملی تقاضوں) نے کبھی فرصت دی تو طلوعِ اسلام اپنی تنگیٔ داماں کے باوجود، ان اہم مباحث کو ضرور سامنے لائے گا۔

محترم حکیم صاحب کا ارشاد ہے کہ جب مقتولین فی سبیل اللہ کی زندگی کے متعلق قرآن شاہد ہے تو انبیاء کرام (جو شہداء سے افضل ہوتے ہیں) لامحالہ زندہ ہوں گے۔ اور جب انبیاء زندہ ہوں گے تو صلحاء و صادقین بھی زندہ ہوں گے۔ ہم اتنا عرض کریں گے کہ منطقی طور پر یہ دلیل وقیع ہو تو ہو۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟ قرآن نے یہ تخصیص صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے کی ہے، اور کسی کے لئے نہیں۔ اگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ انبیاء و صلحاء و صادقین بھی سب اس میں شامل ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کو اس تخصیص کی ضرورت کیا تھی؟ ہماری بحث کا مدار قرآن ہے۔ اس لئے اس باب میں

ثبوت بھی قرآن ہی سے پیش کرنا چاہیے ۔ جی تو ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ جو خصوصیت مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے ہے وہ کم از کم حضرات انبیاء کرامؑ کو ضرور محیط ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے لئے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

محترم حکیم صاحب نے فرمایا ہے کہ معبودانِ باطل سے مراد وہ پتھر اور مٹی کے بت ہیں جن کی پرستش کفار اور مشرکین کیا کرتے تھے۔ لیکن قرآن ان مٹی اور پتھروں کی مورتیوں کے علاوہ، ان انسانوں کا بھی ذکر کرتا ہے جن کی پرستش یہ لوگ کرتے ہیں اور ان کے عدم شعور واحساس کو واضح طور پر بیان کرتا ہے ۔ مثلاً سورۂ احقاف میں ہے:

ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہٗ الیٰ یوم القیمۃ وھم عن دعائھم غفلون ۔ (۲۶/۵)

اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اسے جواب نہیں دیسکتا۔
اور وہ ان کی پکار تک سے بے خبر ہیں ۔

یعنی انھیں ان کی پکار کا علم نہیں اور اگر علم ہوتا بھی تو اس کا جواب نہ دے سکتے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پتھر کے بتوں کے متعلق ہو لیکن اس سے متصل ہے۔

واذا حشر الناس کانوا لھم اعداء وکانوا بعبادتھم کفرین (۲۶/۶)

جب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے تو وہ ان (پرستاروں) کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے انکار کریں گے ۔

یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ ان معبودان سے مراد مٹی اور پتھر کے بت نہیں، انسان ہیں اور انسانوں میں بھی بڑے بڑے مقبول انسان' حتیٰ کہ انبیاء کرام تک بھی ۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ کی پرستش اور ان کے انکارِ پرستش کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے۔ ان سب کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ نہ ان کی سن سکتے ہیں نہ ان کا جواب ہی دیسکتے ہیں ۔

بات عذابِ قبر سے چھڑی تھی ۔ ظاہر ہے کہ عذاب وثواب اعمال کے ظہورِ نتائج کا نام ہے سوال یہ ہے کہ یہ ظہورِ نتائج کب ہوگا! (واضح رہے کہ ہم یہاں ان اعمال کا ذکر نہیں کر رہے جن کے نتائج کا ظہور اس طبیعی زندگی میں ہو جاتا ہے ۔ یہاں ان اعمال کا ذکر ہے جن کا ظہورِ نتائج طبیعی زندگی کے بعد واقعہ ہوتا ہے) ۔ قرآن کہتا ہے کہ یوم یبعثھم اللہ جمیعا فینبئھم بما عملوا (۵۸/۲) یعنی ظہورِ نتائج یومِ بعث کو ہوگا ۔ اور یومِ بعث کے متعلق فرمایا کہ ثم انکم بعد ذالک لمیتون ۔ یعنی اس طبیعی زندگی کے بعد تم پر موت وارد ہوگی ۔ ثم انکم یوم القیمۃ تبعثون (۲۳/۱۵-۱۶) پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے ۔ لہذا قرآن کی رو سے اس طبیعی زندگی اور یومِ بعث کے درمیانی وقفہ کا نام موت ہے اور موت کی حالت میں ظاہر ہے کہ شعور واحساس کچھ نہیں ہوتا۔ اسی وقفۂ موت کا نام قرآن نے برزخ رکھا ہے ۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی میں ہمارا شعورِ ذات جن آسروں پر قائم ہے اس کے بعد کی زندگی میں وہ ان سے مختلف آسروں پر قائم ہوگا (یا یوں کہئے کہ شاید قائم بالذات ہی ہوگا) شعورِ ذات کو اُس نئے "ماحول" کے لئے اپنے آپ کو (Adjust) کرنا ہوگا۔ قرآن اس (Adjustment) کے زمانہ کو برزخ (یعنی عدم احساس و شعور) سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ مختصر سا اشارہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی بہت طویل ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ کروڑوں برس تک مردوں کو بلا احساس و شعور رکھنا کچھ عجیب سا نظر آتا ہے۔ سو یہ "کروڑوں برس" کا تصور ہمارے احساس کا رہینِ منت ہے۔ اگر شعور نہ ہو تو وقت کا احساس ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جو وقفہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح ..... (Level of Consciousness) کے مطابق کروڑوں برس کا ہے، شعور کی سطح بدل جانے سے وہ کلمح البصر (آنکھ جھپکنے کا وقفہ) بن سکتا ہے۔

اب رہا قومِ فرعون سے متعلق آیت کا صحیح مفہوم۔ سو اس میں سوال صرف اسی قدر ہے کہ "النار یعرضون علیھا" میں یعرضون کے معنی حال کے لئے جائیں یا مستقبل کے۔ سو اول تو جب قرآن کے اس قدر شواہد و نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ظہورِ نتائجِ اعمال یومِ بعث ہی کو ہوگا تو اس آیت میں یعرضون کا مفہوم مستقبل ہی کا لیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قرآن نے دیگر مقامات پر خود ان الفاظ کے معانی واضح کر دیئے ہیں۔ یوم یعرض الذین کفروا علی النار۔ (۴۶/۲۰) میں یہی الفاظ ہیں اور مفہوم بالکل واضح۔

بہرحال یہ مختصر سے اشارات ہیں جنہیں سرِدست پیش کیا جا رہا ہے۔ ورنہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ مسائل ایسے ہیں جن پر شرح و بسط سے گفتگو کی جانی چاہئے اور اس کے لئے ہنوز نہ وقت ہے نہ گنجائش۔

میرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

[طلوعِ اسلام]

نغمۂ حیات

ہے حیات حقیقتِ حسنِ ازل یہ فریب و فسون و فسانہ نہیں
یہ ہے قوتِ حق، یہ ہے امرِ خدا، یہ طلسمِ مرورِ زمانہ نہیں
جسے حُسن و جمال خدا نے دیا اُسے زینت و زیب کی کیا پروا
ترے رُخ کو ضرورتِ آئینہ کیا، تری زلفوں کو حاجتِ شانہ نہیں
کبھی اِس کو لگا کبھی اُس کو لگا مگر ایک ہدف پہ کبھی نہ پڑا
ترے تیرِ نگاہ کی ہے یہ خطا کہ یہ تیر اسیرِ نشانہ نہیں
ہو جو حرص و ہوا تو بہ تارِ نفس ترے طائرِ دل کے لئے ہے قفس
نہ ہو پہلے ہی دل جو اسیرِ ہوس کسی دام میں بھی کوئی دانہ نہیں
تری چشمِ اُمید و نگاہِ یقیں پھری عرشِ بریں سے جو سُوئے زمیں
شب و روز نہیں ترے زیرِ نگیں تو سوارِ سمندِ زمانہ نہیں
جسے مُلک ملا فقط اس کے لئے کہ حکومتِ دیں کا نمونہ بنے
اگر اب بھی وہ خدمتِ دیں نہ کرے کوئی حیلہ و عذر و بہانہ نہیں
اسدؔ اب نہیں کوئی بھی اس کا محل کہ جمی رہے محفلِ شعر و غزل
یہ ہیں کام کے دن، یہ ہے وقتِ عمل، یہ زمانہ بزمِ شبانہ نہیں

اسدؔ ملتانی

جب وہ جان چکا ہے کہ یہ حربے بے سود ہیں تو انھیں بارِ دوش بنائے رکھنے سے فائدہ۔ ان اداروں میں بحث و تمحیص تو کھلی ہوتی ہے مگر فیصلے پس پردہ ہوتے ہیں۔ فیصلوں کی تاریں ہلانے والے غیبی ہاتھ ہوتے ہیں۔ کشمیر پر بحث و تمحیص ایک طرف اس سے متعلق جو فیصلہ ہوگا اس کا خمیر التوار کونسل کے عرصہ میں پس پردہ اٹھایا جائے گا۔ فلسطین کے معاملہ میں چودھری صاحب نے ان حرکات شنیعہ کو برای العین دیکھا اور بے باکی سے ان کا پردہ چاک کیا۔ لیکن بین الاقوامی سیاست کے رخ متعین کرنے والے بھلا ان باتوں سے کہاں متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی مفاد پرستانہ سیاست میں اخلاقی اقدار کا دخل نہیں۔

جہنم زار

یہ تو کشمیر کا وہ محاذ ہے جسے سیاست قوت نے لیک سکسیس میں قائم کر رکھا ہے۔ ذرا اصل محاذ پر یعنی وادی کشمیر پر آ کر دیکھئے کہ ہندوستان کے آہنی فوجی پردہ کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ میں تو ہندوستان سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح استصواب ٹل جائے تاکہ کشمیر اس کے ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ اور کشمیر میں ہندوستان ہر ممکن بلکہ یوں کہئے کہ ہر ہندوستانی طریق سے اپنے قدم جما رہا ہے۔ ہندوستانی طریق اسلئے کہ ہندو ذہنیت مسلمان دشمنی کے جس جس قسم کے مظاہرے کر سکی ہے وہ نازیوں کی رسوائے عالم خلاف صیہونیت ذہنیت سے بھی ممکن نہ ہو سکے۔

سردار ابراہیم کا کہنا ہے کہ کشمیر میں ہندوستان دیوانہ وار جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ محترم لیاقت علی خاں فرماتے ہیں کہ ہندوستانی اسلحہ ساز کارخانے رات دن چل رہے ہیں۔ ڈوگرے، سکھ، سیوک سنگھ کشمیر کی وادی سے وادی، کیوں کہئے جنگل میں کھلے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جموں کا صوبہ جس میں ۶۶ فی صدی مسلمان تھے قریباً قریباً ہندو صوبہ بنا دیا گیا ہے۔ ریاستی مسلمانوں پر عرصۂ عافیت تنگ کر دیا گیا ہے۔ ان کی جان، ان کا مال، ان کی آبرو، ان کی عصمت ہندوستانی درندوں اور وحشیوں سے محفوظ نہیں۔ بچے کھچے، لٹے پٹے کشمیری پھر پاکستان کی حدود میں داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کشمیر کا کیا بنے گا؟ یہ درست ہے کہ اس کا مستقبل استصواب سے طے ہوگا، گو وہ بھی یقینی نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کا حال کیسے طے ہوگا؟ استصواب منعقد ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، ہندوستان بظاہر کامیاب نظر آ رہا ہے اور استصواب کا معاملہ ٹلتا ہی جا رہا ہے۔ بظاہر جلد تصفیہ کی توقعات بھی نہیں۔ اگر استصواب کا تصفیہ ہو بھی جائے تو بھی اس کے انعقاد پر خاصا وقت صرف ہو جائے گا لیکن جب تصفیہ ہی نہ ہو چکا ہو تو وقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں کشمیری مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ مشرقی پنجاب اور ملحقہ ریاستوں کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان نے ایک ایک مسلمان کو چن چن کر وہاں سے نکال دیا۔ ان کے اموال و جائداد اس نے ہتھیا لئے۔ ان کی عورتوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ان کے مردوں کو تہ تیغ کیا اور بچے کھچوں کو پاکستان کے دوش پر سوار کر دیا تاکہ اس کی کمر سیدھی نہ ہو سکے۔ یہی داستان کشمیر میں دہرائی جا رہی ہے۔ ہندوستان کو یقین ہے کہ وہ استصواب نہیں جیت سکتا۔ وہ ایک طرف اقوام متحدہ میں بلطائف الحیل اسے ٹال رہا ہے اور دوسری طرف

خون آشامی سے آلِ فرعون بھی پناہ مانگے۔ کوئی مثبت قومی اساس نہ ہونے کے باعث ہندو کے دعووں کی بنا ہمیشہ سلبی رہی۔ سلبی پہلو مثبت پہلو کی مخالفت کا نام ہے۔ چنانچہ ہندو کے اجتماعی کام جذبۂ منافرت کے ہی شرمندۂ تخلیق رہے۔ ہندو کو ہزاروں برس میں پہلی بار نفرت کی اس عادت مستمرہ کو عمل میں لانے کا موقع مل سکا ہے۔ ہزاروں برس کے تحت الشعور میں جمع رہنے والے جذباتِ نفرت کو حالات نے صرف ایک ہی نشانہ دیا اور وہ ہے مسلمان۔ چنانچہ اس نہ ختم ہونے والی نفرت کا لاوا جو مشرقی پنجاب میں پھوٹا تھا اور آہستہ آہستہ خیال ہو چلا تھا کہ ختم ہو گیا ہے، اب مغربی بنگال میں پھوٹا ہے اور اسی پہلی شدت اور بے پناہی کے ساتھ۔

یہ کس طرح ایک طے شدہ منصوبہ بندی کے ماتحت ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اول ہندو مہا سبھا نے کلکتہ میں اپنا اجلاس منعقد کیا اور یہ زہر اگلا کہ ہندو تقسیم ہند کو تسلیم نہیں کر سکتے اور ان کا بھارت بدستور پاکستان کو بھی محیط ہے' اور یہ کہ پاکستان بھارت بن کر رہے گا۔ پاکستان اس آتش افشانی پر احتجاج ہی کر رہا تھا کہ پٹیل دہلی سے کلکتہ پہنچا اور ۱۹۴۶ء کے لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن ڈے کا رونا رویا اور کلکتہ کے فسادات خونیں پر تبصرہ کر کے مہا سبھا کے فتنہ کی آگ کو اور ہوا دی۔ منظم اور چالاک ہندو پریس نے اُدھر کا اشارہ پا کر جیب دیانت چاک کر دی اور مشرقی بنگال میں امن و اطمینان سے رہنے والے ہندوؤں پر مظالم کی فرضی داستانیں شائع کرنا شروع کر دیں۔ پاکستانی ہندوؤں نے خود اس دروغ بافی کا تار و پود بکھیرا اور متعدد مرتبہ اعلان کیا کہ وہ بالکل امن و عافیت سے رہ رہے ہیں۔ لیکن ہندو شور و غوغا اور پروپیگنڈائی آتش بار توپوں کے دہانے ایک دفعہ کھل کر کیسے بند ہو سکتے تھے۔ اس پس منظر میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے دیگر مقامات پر مسلمانوں پر موت و ہلاکت کے دروازے کھول دیئے گئے۔ چنانچہ مغربی بنگال کو مسلمانوں سے خالی کرایا جا رہا ہے۔ آسام کے مسلمان آبادکاروں کو بھی زمین سے بے دخل کر کے پاکستان چلے جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

ہندو ان دنوں عام طور پر تبادلہ آبادی کی باتیں کر رہے ہیں۔ اب تک تو انھوں نے مشرقی بنگال میں ہندوؤں کا رہنا گوارا کیا لیکن اب اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ہندوستانی حکمتِ عملی کا تجزیہ

ہندوستان کی حرکات اور حکمت عملی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان عوامل پر نگاہ ڈال لی جائے جو ان حرکات کا سبب بن رہے ہیں۔ سب سے پہلا تو نفسیاتی پہلو ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ہندو میں جذبۂ نفرت بے پناہ ہے۔ آزادی سے عملی میدان مل گیا ہے۔ حالات نے اس کا رخ مسلمان کی طرف موڑ دیا ہے۔ دوسرا سبب بھی نفسیاتی ہے لیکن سری پرکاشا سابق ہندوستانی ہائی کمشنر متعینہ کراچی) کے الفاظ میں وہ "روحانی" ہے۔ ہندو نظریہ پاکستان کا مخالف تھا۔ اس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ پاکستان قائم نہ ہو۔ یہ دراصل ہندو کے جذبۂ نفرت ہی کا شاخسانہ ہے۔ وہ مسلمان کو عزت و آبرومندی کا مالک نہیں دیکھ سکتا۔ جب حالات نے پاکستان ناگزیر بنا دیا تو ہندو نے عملاً

شکست تو تسلیم کر لی لیکن ذہنی اور روحانی طور پر وہ اس کا قائل نہیں ہو سکا۔ اس نے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرا دیا اور اس کے بعد اپنی حکمت عملی کی اساس اس پر رکھی کہ پاکستان کو ایک نہ ایک دن مٹا دینا ہے۔ ایسا فوجی طاقت سے ہو سکتا ہے مگر وہ ابھی اس قابل نہیں کہ اتنا بڑا فوجی اقدام کر سکے۔ البتہ جوناگڑھ، حیدرآباد اور کشمیر میں اس نے کافی مشق کر لی ہے۔ وہ اپنی تیاریوں میں دیوانہ وار مصروف ہے۔ اس اثنا میں باقاعدہ جنگ سے ورے جو کچھ ممکن ہے اس سے وہ غافل نہیں۔ اقتصادی جنگ اسی ذہنیت کی رہین منت ہے۔

اقتصادی جنگ کے ذکر سے تیسرا عامل خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ عامل معاشی ہے۔ کہنے کو تو یہ تین عوامل ہیں لیکن ان کے تانے بانے کی بافت کچھ اس قسم کی ہے کہ ان کی جداگانہ شناخت دشوار ہے۔ ہندو کے جذبہ نفرت نے پاکستان کی مخالفت کی، پاکستان کو ناگزیر دیکھ کر ہندو نے اسے قبول کر لیا لیکن اس نیت سے کہ اسے موقع پا کر ختم کر کے رہے گا۔ باقی جو کچھ ہو رہا ہے اس کا سرچشمہ یہی کچھ ہے۔ ہندو پاکستان کی مخالفت پر مجبور ہے۔ لیکن حالات کی رو کچھ اس قسم کی ہو گئی ہے کہ اس نے جو کچھ پاکستان کی مخالفت میں کیا اس کا الٹا اثر ہوا اور اس کے اقتصادی مصائب میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ اقتصادی عوامل جو تکلیف دہ نتائج پیدا کرتے ہیں ان سے ملک کے عوام براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ عام غریب ہندوستانی گوناگوں معاشی پریشانیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت ان کے لئے غذائی اجناس کی کمیابی اور غیر معمولی گرانی ہے۔ ہندوستان نے پاکستان دشمنی میں پاکستانی گندم بھی خریدنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کی فالتو گندم کا کیا بنے گا، یہ الگ سوال ہے۔ ہندوستان کے عوام کے لئے تو اس انکار سے غذائی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان مصائب کا لازمی نتیجہ عوام میں بے چینی کی صورت میں برآمد ہو گا۔ لباس و خوراک کی مشکلات کا اثر ہر فرد پر پڑتا ہے اور اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مشکلات کتنی دور رس ہیں اور ان سے کتنے عظیم الشان خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ عہد حاضر میں اقتصادی مصائب کمیونزم کے لئے دعوت ہیں۔ کمیونزم کی پیداوار اور غلبہ اور تسلط کے لئے ایسے حالات موزوں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں کمیونزم کا دور دورہ ہو رہا ہے۔ کمیونزم کے میدان میں آنے سے نئے مسائل اور نئے ہنگامے معرض وجود میں آجاتے ہیں جن کے حل کے لئے یقینی حربے تشدد و بغاوت ہوتے ہیں۔ اس سے عمومی فوضویت پیدا ہوتی ہے جس سے امن عامہ متزلزل ہوتا ہے اور ملک ایک خونیں انقلاب کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے۔

دوری مصیبت

ہندوستان اس دوری مصیبت میں ہے۔ اس مصیبت کا سرچشمہ اس کی ذہنیت ہے اور پھر اقتصادی مشکلات۔ وہ آج اپنی ذہنیت بدل لے تو اس کی سیاست کا مطلع صاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی اس سے کہاں توقع ہو سکتی ہے۔ وہ ایک مشکل کے حل کے لئے دوسری مشکل پیدا کرتا ہے اور دوسری کے لئے تیسری و قس علی ہذا۔ کمیونزم جس شکل میں ہندوستان میں سر اٹھا چکا ہے اسے بھی ارباب اقتدار "مفید مطلب" بنانے کی فکر میں ہیں اور خود پیدا کردہ اقتصادی مشکلات کے لئے سرمایہ دار ممالک سے سودابازی کر رہے ہیں۔ امریکہ کے نزدیک کمیونزم کے خلاف جنگ میں ایشیائی محاذ پر ہندوستان کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

ہندوستان کمیونزم کا حقیقی علاج کرنے کے بجائے اس خطرہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے امریکہ سے سرمایہ حاصل کرنے کا سودا کر رہا ہے۔ یہ اس کی بیرونی پالیسی ہے۔

اندرونی طور پر وہ اس کوشش میں ہے کہ عوام الناس کی توجہ ان مشکلات سے ہٹی رہے جن سے حکومت کی غلط پالیسی نے انھیں دوچار کر دیا ہے۔ حکومت ان کی توجہ کسی اور طرف منعطف نہ کرے تو لامحالہ عوام حکومت کے خلاف احتجاج کریں گے اور ان کی حکمت عملی پر شدید تنقید کریں گے۔ عوام ہند سے مراد ہندو ہیں اور ہندو مسلمان اور پاکستان کے دشمن ہیں۔ چنانچہ ان کے جذبات نفرت سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ مہا سبھا کے ذریعہ ہندو کو مسلمان اور پاکستان کے خلاف مشتعل رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ اس دشمن کی دشمنی میں الجھے رہیں اور حکومت کی غلط کاریوں پر گرفت نہ کر سکیں۔

اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ اثر پاکستان پر پڑتا ہے۔ جو مسلمان گھروں سے نکالے جائیں گے وہ پاکستان کا رُخ کریں گے اور اس طرح پاکستان ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو جائے گا۔ مزید براں پاکستان ہندوستان کا قریب ترین ہمسایہ ہے۔ اندرونِ ہندوستان بدامنی کے جو شعلے بھڑکیں گے ان کی زد پاکستان پر لامحالہ پڑے گی۔ اندریں حالات پاکستان کو ہندوستان کی اندرونی بدامنی و خلفشار کے عوامل پر گہری نظر رکھنی چاہیئے اور اپنے دفاع سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ عام حالات میں ہم حکومتِ پاکستان کو مشورہ دیتے کہ وہ ہندوستان کی مدد کرے تاکہ وہ اس گرداب بلا سے نکل سکے۔ مگر بحالاتِ موجودہ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہندوستان اس جذبۂ دوستی کی قدر کریگا۔ ہندوستان کی بدمزاجی کا تو یہ حال ہے کہ نائب وزیر اعظم پٹیل کہتا ہے کہ میں ہندوستان کے کارخانے بند کرا دوں گا لیکن یہ گوارا نہیں کروں گا کہ پاکستان کے ایک سو روپوں کے عوض میں ہندوستان کے ایک سو چوالیس روپے دوں۔ حالانکہ شرحِ تبادلہ کے اتار چڑھاؤ اقتصادی قوتیں پیدا کرتی ہیں اور ان کی کارکردگی میں ہماری خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تو خیر دوستانہ مدد تو خارج از بحث ہے لیکن پاکستان کی مشکل بدستور رہتی ہے اور اس کے سامنے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا حل بہرحال کرنا ہے۔

ہندوستانی عزائم

ہمیں ایک بار پھر ہندوستان کے عزائم و اقدامات پر نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔ مغربی پاکستان سے ملحق ہندوستانی علاقہ مشرقی پنجاب اور راجپوتانے کا ہے۔ آخر الذکر علاقہ پہلے ہی ہندوانہ تھا۔ اول الذکر کو ہندوستان نے خالص ہندوانہ بنا لیا ہے۔ یہ علاقہ پاکستان کے خلاف اقدامات میں اہم فوجی مرکز ہو گا۔ مشرقی پنجاب میں سکھ آباد ہیں جو ہندوؤں کی خلافِ سکھ ذہنیت سے نالاں ہیں۔ ہندو ان کی بے چینی اور عدم اطمینان کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے چنانچہ گذشتہ دنوں نہرو نے مشرقی پنجاب میں سکھوں کو یہ کہ کر اشتعال دینے کی کوشش کی کہ پاکستان کشمیر سے فارغ ہو کر پٹیالہ کا رُخ کرے گا۔ ہندوستان کے حق میں یہی مفید ہے کہ سکھوں کی توجہ پاکستان کی طرف رہے۔ مشرقی پنجاب کے ساتھ ہندوستان کشمیر پر قابض ہو کر مغربی پاکستان کے شمال مغرب میں ہندوستان نے ہمارے بیوقوف ہمسایہ افغانستان کو دام تزویر میں لے رکھا ہے۔ افغانستان بھی

ہندوستان کی طرح اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے۔ اس کے مصائب بھی حکمرانوں کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہیں۔ اسے بھی بیرون ملک کسی آسان ہدف ملامت کی ضرورت ہے۔ ہندوستان نے اس کی توجہ پاکستان پر لگا دی ہے چنانچہ مغربی پاکستان کو بتدریج محصور کیا جا رہا ہے۔ راجپوتانہ، مشرقی پنجاب، کشمیر، افغانستان۔

اب مشرقی پاکستان کو لیجئے۔ اس کے ایک طرف آسام ہے دوسری طرف مغربی بنگال۔ دونوں صوبوں کی جنگی اہمیت ہندوستان کی نظروں میں قابل فہم ہے۔ مغربی بنگال کو خصوصیت سے مسلمانوں سے خالی کرایا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے عزائم کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ نام نہاد "تحفظ حقوق اقلیت" جماعت نے "عارضی حکومت" قائم کرلی ہے۔ گویا وہ مشرقی پاکستان کو بزعم خود "آزاد" کرانا چاہتے ہیں یعنی بالفاظ صحیح تر ہندوستان سے ملحق۔

اس کے علاوہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو شدھ کرنے کی تحریک شروع کردی گئی ہے۔ ہندو عام طور پر کہتے ہیں اور خود گاندھی نے کئی مرتبہ پاکستان کے خلاف یہ دلیل دی کہ مسلمانان ہندوستان ہندو تھے اور انھوں نے مذہب تبدیل کرلیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو شدھ نہیں کیا جا رہا بلکہ ان کی "بازیافت" ہو رہی ہے۔ یعنی جو ہندو مسلمان ہوگئے تھے انھیں پھر سے ہندو دھرم میں واپس لایا جا رہا ہے۔ ہندو نہایت چالاکی سے اس تحریک کو "بازیافت" کہہ کر دھوکا دے رہا ہے۔

ہمارے پڑوس میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ہندوستان پاکستان دشمنی میں اندھا ہو کر کتنی جنگی تیاری کیوں نہ کرلے، جنگ۔ اور مسلسل بدامنی۔ نہ ہندوستان کے لئے مفید ہے، نہ پاکستان کے لئے۔ ہمیں اس مسئلہ کو بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ مشرق و مغرب کی کشمکش جس مقام پر پہنچ گئی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں ملکوں کی بدامنی یا باہمی جنگ مشرق و مغرب کے لئے دعوت مداخلت ہوگی۔ اس خلفشار سے روس فائدہ اٹھائے گا۔ امریکہ اس کے مقابلہ میں اپنی ڈالری استعماریت مسلط کریگا برعظیم ہند و پاک مشرق و مغرب کی ہوس تفوق کی آماجگاہ بن جائے گا۔ فتح کسی کی بھی ہو دونوں آزادی سلب کر بیٹھیں گے۔

پاکستان کو بہت بچ کے چلنا ہوگا۔ ہمیں کسی کی آزادی کو سلب نہیں کرنا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنا ہے۔ افغانستان کے معاملے پر بھی اسی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ افغانستان میں شورش اور بدامنی یقینی ہے کیونکہ افغان حکومت کے استبداد سے تنگ آچکے ہیں۔ افغانی حکومت کی پاکستان دشمنی اس اندرونی خلفشار کی موجودگی کا بین ثبوت ہے۔ قیاس کیا جا رہا ہے کہ ممالک اسلامیہ بالخصوص مصر مداخلت کرکے افغانستان کو پاکستان کی مخالفت سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ باہمی افہام اور تفہیم اور چیز ہے۔ لیکن پہلا سوال تو یہ ہے کہ اگر افغانستان اس غلط روش سے باز نہ آئے تو مسلمان ممالک کے پاس کونسی قوت ہے جس سے وہ اسے باز رکھ سکیں گے۔ دوسرے جب اس کی علت معاشی ہے تو کیوں نہیں مسلمان ممالک مل کر اس علت کو رفع کرتے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر دیگر مسلمان ممالک ہمدردی سے افغانستان کے اقتصادی مصائب حل کرنے میں مدد دیں تو یہ فتنہ ختم ہو سکتا ہے۔ افغانستان میں بدامنی ہمارے لئے مفید نہیں۔

مسلمانانِ ہند کا تحفظ

فسادات کلکتہ سے متاثر ہو کر ۱۳ فروری کو وزیراعظم پاکستان نے فرمایا:

ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان مظلومین مکمل امن و اعتماد کی فضا میں اپنے گھروں میں واپس آسکیں۔

مظلوم مسلمانانِ ہندوستان جو بلاوجہ گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں ان کی مشکلات کا واحد حل یہی ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ وہ اپنے آبائی گھروں میں امن و عافیت سے رہ سکیں۔ اس اعتبار سے ہم اپنے وزیراعظم کے بیان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جناب وزیراعظم نے ہندوستانی وزیراعظم سے اس ضمن میں مراسلت شروع بھی کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اس معاملہ میں کس حد تک تعاون کریگا۔ مسلمان مظلومین کو بہرکیف عملی اقدامات کی توقع ہوگی اور انتظار رہے گا۔

اس ضمن میں ایک اہم بحث شروع ہو رہی ہے اور وہ ہے تبادلۂ آبادی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان نے جس وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جسمانی و ثقافتی قتل شروع کر رکھا ہے اس کے پیش نظر اس مصیبت کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ ہے مکمل تبادلۂ آبادی۔ یہ حل جتنا صحیح ہے اتنا ہی ناقابل عمل ہے۔ چار کروڑ مسلمانانِ ہند کا پاکستان میں منتقل کرنا اور انہیں آباد و بحال کرنا ایسا امر مہم ہے جو مکمل امن اور غیر معمولی فراغت کا متقاضی ہے۔ پاکستان اس بحث میں الجھ گیا تو وہ مسائل مہم بالخصوص کشمیر سے غافل ہو جائیگا اور یہی ہندوستان کا مقصد ہے۔ چار کروڑ مسلمانوں کے لئے مزید زمین درکار ہوگی۔ ہندوستان زمین دینے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اگر یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں طے کرایا جائے تو بھی تصفیہ کے امکانات چنداں روشن نہیں ہو سکتے۔ کشمیر کا معاملہ دو سال سے لاینحل پڑا ہے۔ اگر جمعیت اقوام متحدہ اتنے عظیم الشان امر کو بطریقِ احسن سرانجام دے سکتی ہے تو وہ یقیناً یہ انتظام بھی کر سکتی ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان موجودہ گھروں میں امن و اطمینان سے رہیں۔ لہٰذا اگر اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کے روبرو پیش کرنا ہی ہے تو اسے اسی رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ اقلیتیں اپنے آبائی گھروں میں امن و اطمینان سے رہ سکیں اور ان کا مذہب ان کے لئے موت و ہلاکت کا باعث نہ ہو۔ حقیقت میں یہ مسئلہ دونوں حکومتوں کے حل کرنے کا ہے۔ کاش جنوبی افریقہ کی نسلی حکمتِ عملی کی اصلاح چاہنے والے ہندوستان کو اپنی نسلی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کرنے کی توفیق ارزانی ہو؟

اس ضمن میں ایک بحث یہ بھی شروع ہو گئی ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان اپنے بچاؤ کے لئے کمیونزم کا استقبال کریں گے۔ معاصر ڈان نے ان کو رمز و ایما سے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ اس خوش خیالی میں ہے کہ حکومت کمیونزم کی ہوگئی تو مسلمان موجودہ شدائد و نوائب سے بچ جائیں گے۔ ہمارا معاصر اس بین حقیقت کو فراموش کر رہا ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کا کوئی مرکزی ادارہ نہیں رکھتے۔ ان میں کوئی تنظیم نہیں۔ وہ ایسے جاں گسل دور سے گزر رہے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سوچ سکتے۔ ان میں کون یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں اپنی قسمت کمیونزم سے وابستہ کر لینی چاہیے۔ پھر اگر بالفرض ایسا ممکن ہو تو یہ دوسری حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ہندو ذہنیت کمیونسٹ مسلمان کو بھی

مسلمان سمجھے گی۔ جیسے کانگرسی مسلمانوں کو فسادات کے دوران میں سمجھا گیا۔ لہٰذا مسلمان کمیونسٹ ہو کر بھی ہندو کے عتاب سے بچ نہیں سکتا۔ بلکہ وہ دہرا مورد عتاب ہوجائے گا۔ اس صورت میں حکومت اس کے خلاف علانیہ اقدام کریگی اور عام ہندوؤں کی تو بات ہی کیجئے۔ حکومت نہ محض بے دریغی سے مسلمان کمیونسٹوں کے خلاف قانونی کارروائی کریگی بلکہ وہ مہاسبھائی اور سنگھی خونخواروں کی پشت پناہی کریگی اور انھیں مسلمانوں کا صفایا کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیگی۔

مسلمانانِ ہند کو ایسے مشورے دینے والے گریبانوں میں منہ ڈال کے سوچیں کہ کیا اپنی ذمہ داریوں سے یوں بالواسطہ عہدہ برآ ہونے کا طریقہ انھیں زیب دیتا ہے؟ اگر مسلمانانِ ہند کا تحفظ ان کے بس کی بات نہیں تو تحفظ کے وعدے اور اس قسم کے کنائے کیا معنی رکھتے ہیں؟

اقتصادی جنگ

ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جو تجارتی اور اقتصادی جنگ شروع کر رکھی ہے اس کے پیش نظر دونوں ممالک کے تجارتی رجحانات مختلف سمتوں کی طرف ہوگئے ہیں۔ ہندوستان نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کو کوئلہ دینا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ پاکستان ریلوں اور کارخانوں کو چلتے رکھنے کیلئے یورپ اور برطانیہ سے کوئلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کوئلہ کا اہم ذریعہ رسد جنوبی افریقہ ہے۔ لیکن اس کی نسلی حکمت عملی کے باعث پاکستان کے تجارتی تعلقات اس سے منقطع تھے۔ حال ہی میں نسلی حکمتِ عملی سے متعلق جنوبی افریقہ، پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے مابین مذاکرات ہوئے۔ پاکستان نے فضا کو سازگار بنانے کیلئے جنوبی افریقہ سے تجارتی تعلقات استوار کرنے کے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ دیگر اشیاء کے علاوہ جنوبی افریقہ کو جوٹ کی احتیاج ہے اور پاکستان کو کوئلہ کی۔ توقع کی جاتی ہے کہ دونوں ممالک کی اہم ضرورتیں باہمی معاہدہ سے پوری ہوجائیں گی۔ پاکستان کو کوئلہ کے یقینی ذرائع دستیاب ہوگئے ہیں۔ اب وہ ہندوستان کے رحم و کرم پر نہیں کہ جب اس کا جی چاہے سال تجارت کی برآمد روک دے اور پاکستان کے نظام معیشت کو متزلزل کر دے۔

ہندوستان نے جنوبی افریقہ پر سے پابندی نہیں ہٹائی، کیونکہ اس کے رویہ میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اپنے ہاں نسلی اور مذہبی منافرت کا اس قدر گھناؤنا مظاہرہ کرتے اور مسلمانوں کا استیصال کلی کر دینے کے عملی پروگرام رکھنے والا ہندوستان جنوبی افریقہ کی نسلی منافرت کے خلاف برسرپیکار ہے!

عالم اسلامی

موجودہ بین الاقوامی سیاست اور عصر حاضر کے تقاضوں نے دنیائے اسلام میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ ممالک اسلامیہ کی سیاسی اہمیت ظاہر ہے اور ان کی اندرونی کمزوری ظاہر تر۔ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں ایسے مفکرین نہیں جو دل و نگاہ کے زاویے بدل دیں اور سیاست ملیہ کو ایک مستقل اور جداگانہ راہ پر ڈال دیں۔ نہ صاحب العزم و قوت مدبرین ہیں جو اندرونی استحکام بھی کریں اور بیرونی دفاع بھی۔ عالم اسلامی میں اس وقت جو حرکت نئے آثار

نظر آ رہے ہیں وہ بیشتر خارج سے پیدا ہوئے ہیں۔ دنیا کی دو بڑی طاقتوں، روس اور امریکہ کے تصادم سے یہ ممالک اور ان کے نظام ہائے معیشت خود بخود بدل رہے ہیں۔

لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے بعد وزیر اعظم پاکستان ممالک اسلامیہ سے ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ مارچ میں شاہنشاہ ایران پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ اس سے بیشتر آزاد حکومت انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر سوئیکارنو پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔ عراق کے ریجنٹ کی تشریف آوری کی اطلاعیں بھی آ رہی ہیں۔ ظاہر شاہ مصر جا رہا ہے۔ اس آمد و رفت سے ایک ہماہمی اور ظاہری رونق ضرور پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دنیائے اسلام جن مسائل و حوادث سے دو چار ہے ان کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ملاقاتوں کو کس حد تک حقیقی بنایا جائے گا۔ یہ ملاقاتیں باہمی روابط کے مظاہر ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان سے دنیائے اسلام کے لئے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی کمزوری، پسماندگی اور باہمی تفریق مسلّمہ ہے۔ کیا یہ ملاقاتیں اس حقیقی اتحاد کی اساس ہو سکتی ہیں جسے قرآن اسلاف کے نام سے پکارتا ہے؟

مصر کے حالیہ انتخابات کا نتیجہ حیران کن نکلا ہے۔ مصر کی وفد پارٹی جس کی حکومت کو ۱۹۴۴ء میں شاہ فاروق نے برطرف کر دیا تھا اور جو اب تک حکومتی کاروبار سے علیحدہ رہی تھی اسے انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ نئی حکومت نحاس پاشا نے مرتب کی ہے۔ اس تبدیلی سے مصر کی پالیسی میں عملاً بہت کم فرق آیا ہے۔

شام کی نئی حکومت نے سعودی عرب سے تجارتی معاہدہ کر لیا ہے مصر سے ایسے معاہدہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔ شام عراق سے بھی معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پالیسی اپنی آزادی کا تحفظ اور اتحاد عرب ہے۔ مصر میں عنقریب عرب لیگ ارکان کے وزرائے اعظم و خارجہ کی مؤتمر منعقد ہو رہی ہے تاکہ مشترکہ پالیسی مرتب کی جا سکے اور عرب لیگ کو از سر نو منظم کیا جا سکے۔ شمالی افریقہ میں مجاہد عبدالکریم نے سپین اور فرانس کو انتباہ کیا ہے کہ وہ ماتحت عربی ممالک کو آزاد کر دیں۔

سابقہ اطالوی مقبوضات کے متعلق نومبر میں جمعیت اقوام متحدہ نے فیصلہ کر دیا تھا کہ لیبیا کو جنوری ۱۹۵۲ء سے پہلے آزاد کر دیا جائیگا۔ سمالی لینڈ دس سال تک اطالوی امانت میں رکھا جائے گا۔ ایریٹیریا کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو جنوبی افریقہ، پاکستان، ناروے، گوئٹے مالا اور برما پر مشتمل ہے۔ یہ کمیشن مقامی باشندوں کی آراء دریافت کرے گا اور جون تک اقوام متحدہ کو اپنی رپورٹ پیش کر دے گا۔ سمالی لینڈ میں اس فیصلہ کے خلاف کافی غیظ و غضب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ حبشہ میں بھی اطالیہ کے قرب سے تشویش و اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اطالیہ کی فوجیں سمالی لینڈ کے علاقہ روانہ ہو گئی ہیں۔

فلسطین سے اطلاعات آ رہی ہیں کہ یہودی جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں اور عربوں پر جنگی تیاریوں کا الزام لگا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے فیصلہ کیا ہے کہ یروشلم اور مقدس مقامات کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا جائے۔ یروشلم کا پرانا شہر اردن کے قبضہ میں ہے

اور نیا شہر یہودیوں کے قبضہ میں۔ اقوام متحدہ نے مجلس تولیت کو اختیار دیا ہے کہ وہ "آئین یروشلم" تیار کرے اور ہیئت حاکمہ نامزد کرے۔ یہودیوں نے اس فیصلہ کی علانیہ مخالفت کی۔ یہودیوں نے یہاں تک کہا کہ اقوامِ متحدہ کی قرارداد ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم یروشلم کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں گے اور جو غلط مدعی داخل ہونے کی کوشش کرے گا اسے روکیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنا دار الحکومت یروشلم کے نئے شہر میں منتقل کر دیا۔ جمعیت اقوام تماشا دیکھ رہی ہے۔

عرب مہاجرین کا مسئلہ بدستور لاینحل ہے۔ وہ مظلومین مطالبہ کر رہے ہیں کہ انھیں یہودیوں کے سپرد کر دیا جائے اور وہ وہاں مرنے کو ترجیح دیں گے۔ کلیپ کمیشن جو مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری کے سلسلہ میں مشرق وسطیٰ کا معاشی جائزہ لے رہا تھا، اس نے چند رفاعی تجاویز پیش کی ہیں جو متفرق عرب ممالک سے متعلق ہیں۔ ان رفاعی امور میں مہاجر مزدوروں سے کام لیا جائے گا۔ یہ بلند بانگ تجاویز کب لباس حقیقت و عمل پہنتی ہیں اور کب ان مظلومین کے دن پھریں گے۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

مشرق و مغرب

انگلستان ان دنوں انتخاباتِ عمومی کی زد میں ہے جو ۲۳ فروری کو منعقد ہو رہے ہیں۔ چرچل نے ایک انتخابی تقریر میں کہا کہ اگر وہ انتخاب جیت کر حکومت بنانے میں کامیاب ہو گیا تو ایک بار سٹالین سے مل کر امن عالم کی کوشش کرے گا۔ امریکہ میں چرچل کو خاص احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ٹرومین کی توجہ اس تجویز کی طرف دلائی گئی اور اس سے استصواب کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ سٹالین سے ملنے کیلئے تیار ہے لیکن صرف واشنگٹن میں۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے بھی ایک موقع پر ٹرومین اور سٹالین میں ملاقات کا سوال پیدا ہوا تھا اور محض اس لئے بے نتیجہ ہو کر رہ گیا تھا کہ ٹرومین مقامِ ملاقات امریکہ رکھنا چاہتا تھا اور سٹالین روس۔ امن عالم کی یہ حالت ہے کہ دنیا ایک تیسری عالمگیر جنگ کے منحوس سائے میں ہے۔ امن و جنگ کے عوامل کے سرچشمے سٹالین اور ٹرومین ہیں۔ ان عالمگیر مسائل کو جن پر امن عالم کا ہی نہیں بلکہ انسانیت کی بقا کا دارومدار ہے اس قدر غیر سنجیدگی سے دیکھا جا رہا ہے کہ یہی مسئلہ لاینحل ہو گیا ہے کہ ملاقات امریکہ میں ہو یا روس میں۔

مشرق و مغرب کی کشمکش نے ایک نئی اور خوفناک ترین شکل اختیار کر لی ہے۔ امریکہ ایک نیا ہائیڈروجن بم تیار کر رہا ہے جسے ایچ بم کہا جاتا ہے۔ دنیا ابھی تک ایٹم بم کی ہلاکت کی خوفناکی سے عہدہ برآ نہیں ہوئی تھی لیکن اس نئے بم سے متعلق اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایٹم بم سے ہزار گنا زیادہ تباہ کن ہوگا۔ ایٹم بم جس نے جاپان کے دو بڑے شہروں کو نیست و نابود کر دیا تھا اس سے ایک ہزار گنا زیادہ تباہ کن بم تیار ہو رہا ہے۔ مشہور سائنسدان آئن سٹائن نے ۱۳ فروری کو ایک تقریر کے دوران میں یہ انتباہ کیا کہ ہائیڈروجن بم کی تابکارانہ سمیت (Radio-active Poisoning) فضا کو مسموم بنا دے گی۔ ایک ماہر سائنس کا خیال ہے کہ یہ تابکاری ہزاروں لاکھوں سال فضا میں موجود رہے گی۔ کئی سائنسدان اس نئے حربے کی خوفناکی سے گھبرا گئے ہیں اور انھوں نے سائنس اور سیاست کو علیٰحدہ کر

ٹرومین کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ایچ بم بنا تو لے لیکن اسے استعمال نہ کرے۔ یہ مشورہ طفلانہ سہی لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ سائنسدان اس نئے آلہ استیصالِ انسان (وانسانیت) کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ٹرومین اسی نئی ملکیت پر نازاں ہے۔ وہ اس کی بلاشرکتِ غیرے ملکیت کو انسدادِ جنگ کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کی نظر انسانیت پر نہیں، بلکہ روس پر ہے۔ اب تک وہ خوش تھا کہ ایٹم بم کا راز صرف امریکہ کے پاس ہے۔ لیکن روس بھی اس راز کو پا گیا ہے۔ اس احساسِ کہتری کو وہ ایچ بم سے پورا کرے گا۔ انسانیت کا کیا بنے گا؟ دیدہ خواہد شد ایک آدمی کی انانیت کی تو تسکین ہو جائیگی!

ایشیاء

حالات کے نئے رجحانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کشمکش کا رخ یقینی طور پر ایشیا کی طرف ہو گیا ہے اور یہ خطہ اب ڈالر اور کمیونزم کا اکھاڑہ بن کے رہے گا۔ سرخ چین کو روس اور روسی حلقہ بگوش ممالک کے علاوہ پاکستان، ہندوستان اور برطانیہ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ روس نے نہ محض سرخ چین کو تسلیم کیا ہے بلکہ ماؤزی تنگ سرخ قائد سے دو مہینوں کے مذاکرات کے بعد معاہدہ بھی کر لیا ہے جو تیس سال تک نافذ العمل رہے گا۔ چیانگ کائی شک اس وقت سارے چین سے بے دخل ہو کر جزیرہ فارموسا میں پناہ گزین ہے۔ اسے توقع ہے کہ وہ چین پر دوبارہ قابض ہو جائے گا۔ امریکہ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ اس گرداب میں کوئی تنکا میسر آئے اس کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں امریکہ کے ایشیائی فوجی (بری، بحری اور ہوائی) ہائی کمان کے افسرانِ اعلیٰ کی کانفرنس نے سفارش کی ہے کہ بحرالکاہل کو فوجی نقطۂ نگاہ سے مستحکم بنانا چاہئے۔ امریکہ کے ایشیائی سیاسی نمائندوں کی بھی ایک کانفرنس انہی دنوں ختم ہوئی ہے۔ امریکہ ایشیا سے متعلق یقینی فیصلہ کر رہا ہے۔ وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ڈالر اور اسلحہ کے زور سے وہ کمیونزم کو زیر کر لے گا۔ کمیونزم کے حربے اپنے ہیں۔ وہ متعلقہ ممالک میں اندرونی انقلاب برپا کرتا ہے اور اسے آزادی کے نام سے پکارتا ہے۔ آزادی کے مقابلہ میں امریکی مدد کو وہ سامراجی مداخلت قرار دیتا ہے۔ کمیونزم ابھی تک کامیاب ہے۔ وہ امریکی اقدامات کے مقابلہ میں صحیح اساس پر استوار ہے۔

ہندچینی میں فرانسیسیوں نے اپنا شہنشاہ باؤدائی مسلط کر رکھا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ڈاکٹر ہوچی من ہے جو اپنے ملک کو فرانس اور فرانس کے حلقہ بگوشوں سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی دعوت زیادہ قابلِ قبول ہوگی۔ حال ہی میں روس، چین اور دیگر کمیونسٹ ممالک نے ہوچی من کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر ہو نوے فی صدی ملک کا نمائندہ ہے۔ امریکہ اور برطانیہ نے محض روس کی ضد میں باؤدائی کو تسلیم کر لیا ہے۔ نیز باؤدائی کی پشت پر ایک بڑی دولت یعنی فرانس ہے جو شمالی اوقیانوسی معاہدہ کی ایک معاہد دولت ہے۔ امریکہ اس کی امداد سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ وہ جائز و ناجائز اس کی مدد کرے گا۔ ہندچینی کی سرحدیں چین سے ملی ہوئی ہیں۔ اب جبکہ روس اور چین نے ڈاکٹر ہوچی من کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے ان کی طرف سے اسے بے دریغ امداد ملے گی۔ ظاہر ہے کہ ہندچینی میں خانہ جنگی کے شعلے اور تیزی سے بھڑکیں گے۔

انڈونیشیا

روس، انڈونیشیا کی آزادی پر تو خوش نہیں تھا لیکن حیران کن سرعت سے اس نے انڈونیشیا کو تسلیم کر لیا ہے۔ انہی دنوں ایک سابق ڈچ فوجی افسر نے جس انداز سے بغاوت کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈچ کن اوچھے حربوں سے انڈونیشیا کی آزادی کو بے حقیقت بنانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک جماعت جس کی قوت اور تعداد کا صحیح علم نہیں دیا گیا بھی اس باغی افسر ویسٹرلنگ کی شریک بتائی جاتی ہے۔ فی الحال اس بغاوت کو فرو کر لیا گیا ہے۔ لیکن مستقبل سے متعلق پیشین گوئی مشکل ہے۔ بہرحال قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انڈونیشیا میں بدامنی اور خلفشار یقینی ہے۔ اس کا باعث کچھ ہی کیوں نہ ہو، روس اسے مفید مطلب بنائیگا۔ اس لئے اس نے اپنے نمائندہ کی موجودگی وہاں ضروری سمجھی اور انڈونیشیا کو تسلیم کر لیا۔

برما

پاکستان کا قریبی ہمسایہ ہے اور بدامنی اور خانہ جنگی میں گرفتار ہے۔ حالیہ کولمبو کانفرنس نے فیصلہ کیا تھا کہ برما کی حکومت کو مالی امداد دی جائے تاکہ وہ اپنی مشکلات پر قابو پا سکے۔ انہی دنوں حکومت پاکستان نے پانچ لاکھ پونڈ قرضہ برما کو دینا منظور کیا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ پاکستان اپنے ہمسایوں کی امداد کی قدرت رکھتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ برما جس کشمکش کی آماجگاہ بن چکا ہے اس میں پاکستان کی اس امداد سے یہ مفہوم تو نہیں لیا جائے گا کہ وہ دو عالمگیر بلاکوں میں سے ایک کی طرفداری کر رہا ہے؟ برما کا خلفشار ہمارے لئے مفید نہیں۔ مگر کسی ایک بلاک سے علانیہ مل جانا بھی تو چنداں خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ حیرت کا مقام ہے کہ حکومت نے اس قرضہ کی تفصیلات واضح نہیں کیں اور اخبارات میں مختصر سی خبر پر قناعت کرلی۔ حکومت کو ایسے اہم امور سے متعلق مفصل بیان دینا چاہئے تھا۔

صرف چار روپے میں

کتابی سائز کے ۵۰۰ کاغذوں پر لیٹر فارم (پیڈ)، اشتہار، لیبل، ہینڈبل، کیش میمو، یا جو کچھ بھی آپ چھپوانا چاہیں اردو زبان میں چھپوالیں۔

پاکستان سے چار روپے، ہندوستان سے چھ روپے

اسی سائز پر انگریزی چھپائی کے لئے

پاکستان سے پانچ روپے، ہندوستان سے آٹھ روپے

اس خرچہ میں چھپائی اور کاغذ کی قیمت سب کچھ شامل ہے۔

مکتبہ خیابانِ ادب ۹۰ بی بی راولپنڈی۔ پاک

۲۱۔ اپریل

"پھر بہار آئی" کے مصداق پھر ۲۱۔ اپریل یعنی علامہ اقبال کا یوم وفات آرہا ہے۔ اس مردِ درویش کا یوم وفات جس نے مسلمانوں کو پاکستان کا تصور دیا، وہ تصور جس کے متشکل ہونے پر آج سات کروڑ مسلمان انسانی درندوں سے محفوظ و مصئون زندگی گذار رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ دن تیسری مرتبہ آرہا ہے۔ حکومت پاکستان نے روزِ اول سے ہی اس دن کو نظر انداز و فراموش کر دیا تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۸ء کے طلوعِ اسلام میں جب حکومت کی توجہ اس فروگذاشت کی طرف دلائی گئی کہ سرکاری تعطیلات میں یوم اقبال کو تعطیل قرار نہیں دیا گیا تو طلوعِ اسلام کو حکومت کی طرف سے جواب ملا کہ فہرست تعطیلات پورے غور و خوض کے بعد کابینہ کی منظوری سے مرتب کی گئی ہے جس پر اضافہ بعد از وقت ہے۔ اس پر پھر حکومت کے گوش گذار کیا گیا کہ حکومت علامہ اقبال کے احسانات کا اعتراف کرنا چاہے تو ابھی تعطیل کا فیصلہ کرنے میں کافی وقت ہے۔ یہ گذارش مقبول ہوئی اور حکومت نے ۲۰۔ اپریل کی شام کو اعلانِ تعطیل کر دیا اور طلوعِ اسلام کو جواب دیا کہ

حکومت مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کیلئے مرحوم کے بے مثال عطایا کی یاد میں اس دن تمام دفاتر بند رہیں گے۔

پہلے سال تو خیر حکومت نے اس بدسلیقگی سے عین آخر وقت چھٹی کا اعلان کر دیا لیکن گذشتہ سال اور امسال "نظریۂ پاکستان کے لئے مرحوم کے بے مثال عطایا کی یاد" کو حافظوں سے محو کر دیا گیا اور ان عطایا کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ یوم اقبال کو مستقل تعطیل قرار دیا جائے۔ حالانکہ حکومت نے جنم اشٹمی، دسہرہ، دلہنڈی، شاہِ انگلستان کی سالگرہ وغیرہ ایسے ایام کو عام تعطیلات قرار دے رکھا ہے۔

گذشتہ سال ۲۱۔ اپریل کو معاصر "ڈان" نے "اقبال کی یاد میں" ضمیمہ خصوصی شائع کیا تو اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہوئے پاکستان کے گورنر جنرل نے فرمایا تھا:

> (ڈان کی یہ کوشش) ہمارے اس مفکر اعظم کی یاد میں ایک قلیل سی نذر ہے جس نے ہمیں پاکستان کا تصور عطا فرمایا۔ اقبال اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کیلئے زندہ نہ رہا لیکن اب کہ پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے، ہم اس پیغام حیات بخش کی یاد کو جو اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو دیا تھا، جذبۂ احسانمندی سے تازہ کرتے ہیں۔ . . . . . . مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کو ایک عظیم اور ترقی یافتہ مملکت بنانے میں تمام کوششیں، اقبال کی تعلیمات سے ہمیشہ فیضیاب اور حرکت گیر ہوتی رہیں گی۔

ہم گورنر جنرل صاحب کی خدمت میں بادب گذارش کرتے ہیں کہ "اس مفکر اعظم کی یاد میں" حکومت جو "قلیل سی نذر" پیش کر سکتی تھی وہ اس نے

نہیں کی اور اقبال کے "پیغامِ حیات بخش" کی یاد کو حکومت نے فراموش کر دیا ہے۔ اس احسان فراموشی پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے لیکن ہم بقول غالب

تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب　　　　یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

حکومت کو ہر سال اس کی یاد دہانی کرا کے خود شرمسار نہیں ہونا چاہیئے۔

خیر ایک طرف تو حکومتِ پاکستان کی یہ فراموشی ہے اور دوسری طرف قوم کی یہ یاد آوری کہ اس دن مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، قوالیاں ہوتی ہیں اور مرحوم کا کلام گا گا کر بھیپھڑوں کی طاقت اور گلے کی غنائیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ وہ اقبالؒ جو حضورِ رسالتؐ رو رو کر "تہمتِ شعر و سخن" پر فریاد کرتا ہے کہ

من اے میرِ امم داد از تو خواہم　　　　مرا یاراں غزلخوانے شمردند

اس اقبال کی یاد اس انداز سے منائی جاتی ہے گویا کہ وہ بھانڈوں کی قوم کا سردار تھا۔ ایسی یاد سے تو فراموشی اچھی۔ مرحوم کو کم از کم قبر میں تو اطمینان سے لیٹنا مل جائے گا۔ اس یاد پر ہم حکومت کی فراموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم مسلمانانِ پاکستان سے یہ دلی گذارش کرتے ہیں کہ اگر وہ اقبال کو صحیح معنوں میں پہچان کر ان کے شایانِ شان یادگار قائم نہیں کر سکتے تو ان کی اس انتہائی توہین سے باز رہیں۔

لاہور میں مجلس مرکزیہ یومِ اقبال عرصہ سے قائم ہے۔ یہ مجلس یومِ اقبال منانے کی غرض سے معرضِ وجود میں آئی تھی اور یہ دن منانے میں اُسے اولیت کا فخر بھی حاصل ہے۔ ہم اس مجلس کے کارکنوں سے عرض کریں گے کہ وہ اس یوم کے انصرام و اہتمام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور ایسا پروگرام مرتب کریں کہ پاکستان بھر میں ایک نظم کے ماتحت یومِ اقبال منایا جائے اور حقیقی اقبال کو ملک و ملت سے روشناس کرایا جائے۔ اس موقع پر ایسے اربابِ علم و بصیرت سے اقبال سے متعلق مقالات لکھوائے جائیں جو اقبال اور قرآن پر گہری نگاہ رکھتے ہوں اور بعد میں ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ اس طرح اقبال پر مفید اور ضروری لٹریچر جمع ہو جائے۔ اگر یہ دن محض ایک 'عرس' کی شکل اختیار کر گیا اور بظاہر آثار ایسے ہی نظر آ رہے ہیں تو یہ نہ محض اقبال سے ناانصافی ہوگی بلکہ مسلمانوں کا خود اپنے اوپر صریح ظلم ہوگا۔ مُردوں کے عرس منانے والی قوم مردہ ہی ہوتی ہے۔ ہم عام مسلمانوں سے گذارش کریں گے کہ وہ خدا کے لئے اپنی اپنی دفلی بجانے سے باز آئیں اور یومِ اقبال کو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے انداز میں منانے کی کوشش بیہودہ ترک کر دیں۔ یہ فریضہ مجلس مذکورہ کے ذمہ ہی رہنے دینا چاہیئے تاکہ اس انتشار میں مرکزیت کی صورت پیدا ہو سکے اور مسلمان اسلامی مملکتِ پاکستان اور اقبال دونوں کے شایانِ شان طریق سے یومِ اقبال منا سکیں۔

کچھ اپنے متعلق

۱۔ طلوعِ اسلام کی خریداری کے سلسلہ میں عام طور پر یہی التزام رکھا جاتا ہے کہ خریداری نئے سال سے شروع ہو اور سال کے خاتمہ پر ختم ہو جائے۔ اس کے باوجود بعض خریدار ایسے ہیں جو سال کے دوران میں چندہ ارسال کرتے ہیں اور پرانے پرچے موجود نہ ہونے کے باعث ان کی میعادِ خریداری دوسرے سال میں شمار کر لی جاتی ہے۔ چونکہ اکثر و بیشتر قارئین پچھلے سال کے خریدار ہیں اس لئے سابقہ پرچوں میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ جملہ خریداروں کے چندے دسمبر کے ساتھ ختم ہو چکے ہیں۔ جن حضرات کے چندے باقی تھے، ان کی تصحیح کر دی گئی ہے اور ان کو فرداً فرداً اطلاعیں جا چکی ہیں۔

۲۔ طلوعِ اسلام نے پاکستانی زندگی کے دو سال کیسے گزارے؟ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ سرمائے اور جماعتوں کی پشت پناہی کے بغیر بہت کم جرائد زندہ رہ سکتے ہیں، بالخصوص ایسے جرائد جن کا مسلک و مشرب طلوعِ اسلام جیسا ہو۔ طلوعِ اسلام کسی جماعت کا پرچہ نہیں، نہ اس کی پشت پر کسی فرد کا سرمایہ ہے۔ ان نامساعد حالات کے باوجود ادارہ درویشی اور خسروی کے حسین امتزاج کے ساتھ اس چراغ کو جلتا رکھنے میں کامیاب رہا۔ کیسے؟ یہ نہ پوچھئے۔

۳۔ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ دس روپے تجویز کیا گیا تھا اور ایک پرچہ کی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی تھی۔ ہمیں احساس تھا کہ بے شمار وابستگانِ طلوعِ اسلام اس بدلِ اشتراک کے متحمل نہیں ہو سکیں گے، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اس کی دعوت پر سب سے پہلے خلوص و شیفتگی سے لبیک کہنے والے وہی لوگ ہوں گے جن کے قلوب زندہ ہوتے ہیں اور جیب و شکم خالی۔ لیکن خرچ کم سے کم کر دینے کے باوجود اصل لاگت مجوزہ بدلِ اشتراک سے کم نہ ہو سکی۔ گذشتہ دو سالوں میں تقاضوں پر تقاضے آتے رہے کہ قیمت میں تخفیف کی جائے۔ ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کے سامنے اپنے آپ کو مجبور پا کر بالآخر ہم نے اس سال سے قیمت نصف کر دی ہے۔ آپ کا تقاضا پورا ہو گیا۔ بظاہر اس سے آپ پر بھی ذمہ داری آنی چاہئے۔ دیگر جرائد کی طرح اگر ہم آپ سے اپیل کریں کہ آپ خریداروں کا حلقہ وسیع کیجئے تاکہ اس نقصانِ عظیم کی کچھ تلافی ہو سکے جو قیمت نصف کر دینے سے ادارہ کو اٹھانا پڑے گا تو شاید ہم حق بجانب ہوں۔ لیکن ہم اس اپیل کے قائل نہیں، کیونکہ طلوعِ اسلام کا مقصد تجارت نہیں۔ لہٰذا یہ اپنے معاملات کو کاروبار کی میزان میں نہیں تولتا۔ یہ ایک رسالہ نہیں جو قارئین سے شاعر اور گاہک کا تعلق پیدا کرے اور بس۔ طلوعِ اسلام قرآنی انقلاب کا نقیب و داعی ہے لہٰذا اسے خریداروں کی ضرورت نہیں، عام اس سے کہ اس کا کاروبار سودائے زیاں ہی ہے۔

اسے ضرورت ہے تو صاحب ایمان کارکنوں کی، ان رضا کاروں کی جو اس دعوت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور قرآن جن کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اور وہ اس پیغام کو چار سو لئے پھرتے ہیں، نتائج دعواقب سے بے پروا۔ صلہ اور تحسین کی آرزو سے بے گانہ!

۴۔ تخفیف چندہ کی اطلاع جنوری کے آخر میں حتی الوسع تمام قارئین کو فرداً فرداً دی گئی تھی۔ چونکہ فیصلۂ تخفیف بتاخیر ہوا اس لئے بعض قارئین نے ہماری پہلی اپیل پر پرانی شرح یعنی دس روپے کے حساب سے چندے ارسال فرما دیئے اس کے متعلق فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان حضرات کے بقیہ چار روپے ہمارے پاس امانت رہیں گے اور آئندہ سال کے چندہ میں شمار کر لئے جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی صاحب معارف القرآن خریدنا چاہیں تو یہ رقم اُدھر مجریٰ کر دی جائے گی۔

۵۔ پرچے بھیجنے کے متعلق بہت احتیاط کی جاتی ہے اور پوری جانچ پڑتال کے بعد ہر خریدار کے نام پرچہ ارسال کیا جاتا ہے۔ چونکہ ڈاک کا انتظام ابھی تک کما ینبغی درست نہیں ہوا اس لئے پرچے بدستور گم ہو رہے ہیں۔ پرچہ نہ پہنچنے کی جو اطلاعیں ہم تک آتی ہیں انھیں حتی الامکان بلا مزید قیمت لئے پورا کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بعض حضرات پرچہ نہ ملنے پر ہم پر غصہ کا اظہار فرماتے ہیں۔ ان کا غصہ سر آنکھوں پر لیکن اندازہ لگائیے کہ پرچہ کو یہاں سے روانہ ہونے اور آپ تک پہنچنے میں کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہماری ذمہ داری تو رسالہ بھیج دینے کی ہے۔ اسے آپ تک پہنچا دینے کا کام تو بہرحال ڈاکخانہ کا ہے۔ آپ مزید اطمینان چاہتے ہیں تو پرچہ بذریعہ رجسٹری منگائیے اور ہر فی پرچہ کے حساب سے مزید رقم ارسال فرمائیے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ڈاک کا انتظام خاطر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے خریداروں کو یہ مزید خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہم سوائے اظہار افسوس و ہمدردی کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

۶۔ جنوری و فروری کی مشترکہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ پرچہ کی اہمیت کے پیش نظر تمام سابقہ خریداروں کو پرچہ بھیجا جا رہا ہے۔ اس اعلان کے علاوہ تمام حضرات کی خدمت میں یاددہانی کے خطوط بھی روانہ کر دیئے گئے تھے۔ لہٰذا جن حضرات کے چندے ابھی تک نہیں آئے ان کی طرف مارچ کا پرچہ نہیں بھیجا جا رہا۔ امید ہے کہ وہ ہمیں معذور تصور فرمائینگے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

قرآنی لٹریچر میں نئی کوشش

معزز معاصر ڈان نے "معراج انسانیت" پر جو تبصرہ ۱۲ فروری ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں کیا ہے اس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

مصنف نے بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد تفہیم قرآن کے متعلق لٹریچر میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا ہے وہ یقیناً مستحق مبارکباد ہیں۔

قرآن انسانی زندگی کے گوناگوں شعبوں کیلئے مکمل ضابطہ ہدایت ہے۔ قرآن اس قانون خداوندی کا حامل ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسانیت اپنے مقصد حیات کو پاتی اور منتہی کو پہنچتی ہے۔ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ قرآن ان ابدی اصولوں کو جو ہماری معاشی اور آفاقی زندگی کی اساس ہیں ہمارے روزمرہ کے تجربات و مشاہدات سے مثالیں لے لیکر واضح کرتا ہے لیکن اس کے انداز بیان کا یہ معجزہ ہے کہ وہ علمائے فلسفہ کے لئے فلسفہ کے اسرار و غوامض ہوتے ہیں اور علمائے سائنس کے نزدیک ان لاینحل عقدوں کی کشائش جن سے وہ عاجز آ چکے ہوں۔

ظاہر ہے کہ قرآنی دائرۃ المعارف کے مرتب و مدون کو قرآن کے اس اسلوب سے گہری واقفیت ہونی چاہئے جس سے وہ اپنے جواہر پاروں کو فطرت کی گہرائیوں سے نکال نکال کر قاہرا دامن انسانیت کو مالا مال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مرتب کو نہ محض سائنس اور فلسفہ کے علوم پر پورا عبور ہونا چاہئے بلکہ اس کا دیگر مذاہب کا مطالعہ بھی مکمل ہونا چاہئے ان تمام صفات کا حسین امتزاج جناب پرویز کی شخصیت ہے۔ انھوں نے قرآن کی تفسیر کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر موضوع پر تمام متفرق قرآنی آیات کو یکجا کر کے ان کے ربط اور معنی کو واضح کیا جائے۔

ان کی کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد کا موضوع "اللہ" ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان کا کیا مفہوم ہے اور کیسے یہ مفہوم ذہنی انقلاب پیدا کر کے وحدت انسانی میں نتیج ہوتا ہے؟

دوسری جلد تخلیق و ارتقائے انسانی سے متعلق ہے۔ ابلیس، ملائکہ، وحی وغیرہ موضوعات پر اس میں سیر حاصل تبصرہ ہے۔

تیسری جلد تاریخ رسالت ہے اس میں رسول اکرمؐ سے پیشتر تک انبیاء کی سیرتوں اور کارناموں پر بحث کر کے بتایا گیا ہے کہ کیسے قرآن قوموں کے عروج و زوال کے تاریخی اسباب کی یاد دہانی کراتا ہے۔

چوتھی جلد "معراج انسانیت" ہے اور حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ جلد رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ پر مشتمل ہے۔ اس میں اس زمانے کے مذاہب اور تہذیب کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح حضورؐ کی حیات مبارکہ انسانیت کیلئے نسلاً بعد نسلاً ہدایت کا بلند ترین مینار نور ہے۔ کتاب کے ۸۸۲ صفحات ہیں، گلیزڈ کاغذ پر چھپی ہوئی ہے اور خوبصورت جلد ہے۔

—•—

معاشیات

معاشیات کی واقفیت کے بغیر آپ کسی مسئلے کے متعلق بھی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کیونکہ آج ساری دنیا معاشی محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ چنانچہ ہر سیاسی، تمدنی، سماجی اور تعلیمی مسئلہ کی تہ میں معاشی اثرات ہی کارفرما نظر آتے ہیں، وقت کی اس اہم ترین ضرورت کو پورا کرنے کیلئے انجمن ترقی اردو ایک ماہوار معاشی رسالہ "**معاشیات**" شائع کرتی ہے جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا اور واحد رسالہ ہے۔

اس میں نظری اور عملی معاشیات اور پاکستان، ہندوستان، اسلامی اور دوسرے ملکوں کے معاشی مسائل کو علمی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، ضروری اعداد و شمار، معاشیات کی اردو اصطلاحیں اور ان کی تشریح اور علمائے اسلام کے معاشی افکار کی اشاعت اس رسالے کے بنیادی مقاصد ہیں آپ کے واسطے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ضخامت ۶۴ صفحات، سالانہ چندہ چھ روپے، فی پرچہ آٹھ آنے

اشاعت کی غرض سے مضمون "معتمد اعزازی رسالہ معاشیات" کے نام ارسال فرمائیے۔

دفتر کل پاکستان انجمن ترقی اردو، اسپتال روڈ، کراچی نمبر ۱

چڑیا چڑے کی کہانی

اور بادشاہوں کے قصوں کا زمانہ گزر چکا۔ ادب اب جامد افکار کا ڈھیر نہیں رہا۔ یہ اپنا ایک مقصدِ وجود رکھتا ہے۔ اس کا مقصد تخلیق انسانی زندگی کی آفاق گیر قدروں کو سربلند و باوقار بنانا ہے۔ ادب انسانی معاشرے کی رگوں میں بہنے والا زندہ خون ہے۔ یہ کسی افیونی کے سر کے خمار نہیں۔

ہفتہ وار جہانِ نو

ایسا ہی ادب پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے افسانہ نمبر میں انسانوں کی دھڑکتی ہوئی زندگیاں پیش کر رہا ہے۔ اس کا افسانہ نمبر ان تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ جو مقصدی اور افادی ادب کیلئے ناگزیر ہیں۔ جہانِ نو اردو میں ایک نئے افسانوی ادب کی طرح ڈال رہا ہے۔

مارچ کے آخری ہفتے میں افسانہ نمبر شائع ہوگا۔

ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ رنگین سرورق۔ کتابی سائز۔

قیمت: ڈیڑھ روپیہ

خریداروں کو زرِ چندہ میں ہی بھیجا جائے گا۔ ایجنٹ حضرات اپنی صحیح ضرورت سے جلد از جلد آگاہ فرمائیں۔ مشتہرین کے لئے اپنی مصنوعات کی تشہیر کا ایک نادر موقعہ ہے۔

منیجر ہفتہ وار جہانِ نو ۔ یعقوب خاں روڈ۔ کراچی

آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے

اس لئے ایسے قیمتی لمحات کو ضائع نہ کیجئے۔ ذرا سوچیئے کہ اگر آپ کو ضروریات کی دس متفرق چیزیں خریدنی ہوں تو اُن کی تلاش میں آپ کا کس قدر وقت صرف ہوگا اور پریشانی کتنی اٹھانی پڑے گی۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں آپ کو

ایک ہی جگہ مل جائیں

مال بھی بہترین ہو اور قیمتیں نہایت واجبی۔ تو آپ کا کس قدر قیمتی وقت اور پریشانی بچ جائے گی۔

ہمارے ہاں

ہوزری کا ہر قسم کا انگلش اور جاپانی مال۔ قسم قسم کا ٹائیلٹ کا سامان۔ سنڈریز (بساط خانہ کی چھوٹی موٹی تمام چیزیں) سائیکل۔ بسکٹ۔ انگریزی مٹھائی وغیرہ ہول سیل نرخوں پر فروخت ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تشریف لائیے۔ دیکھئے آپ کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔

احمد اینڈ احمد کمپنی۔ سرائے روڈ۔ (نزد سندھ مدرسہ) کراچی ۲

این کتاب از آسمانِ دیگر است

معراجِ انسانیت، معارف القرآن کی چوتھی جلد ہے۔ جس میں ترجمانِ حقیقت جناب پرویز نے سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینہ میں پیش کی ہے۔ فی الحقیقت اسلامی لٹریچر میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔

شروع میں تمام مذاہبِ عالم کی تاریخ اور ان کا تہذیبی پس منظر ہے۔ پھر سیرت حضور سرورِ کائنات ہے جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔

بڑے سائز کے ۸۸۲ صفحات۔ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط اور حسین جلد۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔

قیمت: بیس روپے

محصولڈاک اور پیکنگ ڈھائی روپے

تاجرانِ کتب براہِ راست خط و کتابت فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

عارف پبلشنگ ہاؤس

رابسن روڈ۔ کراچی

مستقبل کی فکر نہ کریں

یہ چیز عرصہ دراز سے زیرِ غور تھی کہ ہماری قوم کا متوسط طبقہ کس طرح سے مستقبل کے فکرِ مستقل سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارا یہ طبقہ عام طور پر ملازم پیشہ ہے دورانِ ملازمت میں بندھی ہوئی تنخواہ روٹی کا وسیلہ بنی رہتی ہے لیکن یہ میعاد بھی تو پائیدار نہیں، ایک وقت آئے گا کہ پنشن مل جائیگی، تنخواہ نصف ہو جائے گی اور اخراجات چوگنا بڑھ جائیں گے ٹھیک اس وقت آپ سوچیں گے کہ کاش اس سے قبل ہم نے کسی اچھے کاروباری ادارہ میں تھوڑا بہت سرمایہ لگایا ہوتا۔ اس فکر سے بچنے کیلئے آپ آج ہمارے کاروباری ادارہ کتاب لمیٹڈ کا ایک حصہ خرید لیں۔ یہ ایک حصہ ہزار روپیہ کا ہے اور سہولت یہ ہے کہ چار قسطوں میں رقم ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے بہتر کاروبار اور اس سے زیادہ منافع دینے والا ادارہ پاکستان میں آپ کو نہیں ملیگا۔ دو روپے بھیجکر کتاب لمیٹڈ کے کاغذات طلب فرمائیں۔

ملت کا خادم۔ جے۔ بی۔ عارف

منیجنگ ڈائرکٹر۔ کتاب لمیٹڈ

رابسن روڈ۔ کراچی

THE ISLAMIC LITERATURE

A MONTHLY RELIGIOUS JOURNAL IN ENGLISH WITH A DIFFERENCE

To be a measure to collect, gradually the scattered forces of Islamic Renaissance, which in no distant future is to serve as the foundation of that new world order for which there is a cry everywhere but about the nature of which nobody is clear yet.

While the test of the world figure things sordid, let us inspire the denizens of the world with a higher vision of life

Your active co-operation is needed.

SUBSCRIPTION :

Rs. 12 - a year ; Rs. 7/- for six months

Send Rs. 1/4/- for specimen copy.

Shaikh Muhammad Ashraf

Sponsor : THE ISLAMIC LITERATURE

Kashmiri Bazar, Lahore